الرسالہ

Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

1372



TOKYO MOSQUE, JAPAN (1938)

ہر نئی صبح یہ پیغام لے کر آتی ہے کہ کام کرنے کا
ایک اور قیمتی دن انسان کو دے دیا گیا

INDIAN MUSLIMS
The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۹

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel 4611128 Fax 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

قومیت کا مسئلہ

۱۹۹۲ کا سال میرا ملاقاتوں کا سال رہا ہے۔ اس دوران میں نے ملک کے مختلف حصوں کے سفر کیے۔ بہت سے اجتماعات میں شرکت کی۔ کثرت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ میں نے پایا کہ بیشتر لوگ ملک کے مستقبل کے بارہ میں ناامید ہیں۔ مگر مجھے ایسے لوگوں سے اتفاق نہیں۔ اب بھی میں انڈیا کے مستقبل کے بارہ میں پوری طرح پُرامید ہوں۔

میرا عقیدہ ہے کہ ناامیدی فطرت کے نظام کے خلاف ہے۔ اور جو چیز فطرت کے نظام کے خلاف ہو وہ کبھی قابل لحاظ نہیں ہو سکتی۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ہماری دنیا میں ہر شام کے بعد صبح آتی ہے۔ یہ نظام اتنا زیادہ محکم ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک فلکیات داں اس پوزیشن میں ہے کہ ہزار سال بعد آنے والی صبح کا وقت وہ آج ہی ٹھیک ٹھیک بتا سکے۔ پھر جس دنیا میں ہر ۲۴ گھنٹے کے اندر شام کے بعد صبح کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہاں ناامیدی کے اندھیرے کے بعد امید کا اجالا ظاہر نہ ہو۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو کئی اخباروں نے لکھا کہ اب مسجدوں کے انہدام کا وہ طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کے لیے عرصہ سے ۳۰۰ یا ۳۰۰۰ ہزار مسجدوں کی فہرست پیش کی جا رہی تھی۔ مگر میرا تاثر اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے کہا کہ نہیں اب کوئی اور مسجد نہیں ٹوٹے گی۔ اب ہمارے ملک سے "اینٹی مسجد" سیاست ختم ہو گئی۔ لوگ ۶ دسمبر کو آغاز سمجھ رہے تھے۔ مگر میں نے کہا کہ نہیں، یہ اختتام ہے۔

اپنے اسی یقین کو ایک فارمولا کی صورت دیتے ہوئے میں نے کہا کہ "مسلمان ایک پر چُپ ہو جائیں اور ہندو ایک کے بعد پر چُپ ہو جائیں"۔ ابتدا میں بہت سے لوگوں کو یہ فارمولا عجیب معلوم ہوا تھا۔ مگر آج دیکھئے تو دونوں فرقے بلا اعلان اسی اصول پر قائم ہو چکے ہیں۔ ۶ دسمبر کے بعد مسلمان ایک مسجد پر چپ ہو چکے ہیں اور ہندو ایک کے بعد کی مسجدوں پر چپ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ بظاہر دونوں طرف کے کچھ غیر اہم افراد کبھی کبھی سابقہ بولی بولتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ مگر یہ بدترین قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے جو کبھی دیر تک چلنے والی نہیں۔

میرے اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ اس دنیا میں ہر تخریب کا ایک خاتمہ (end) ہے۔ جب کوئی تخریبی تحریک اپنا آخری واقعہ کر ڈالے تو اس کے بعد خود اس کا بھی آخری وقت آجاتا ہے۔ انسانی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔

اسی طرح ایک مسئلہ اس تحریک کا ہے جس کو عام طور پر ثقافتی قومیت (culturalism nationalism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم ملک کے موجودہ کمپوزٹ کلچر (مشترک کلچر) کو بدل کر اس کو واحد انڈین کلچر کے روپ میں ڈھالیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ ملک میں سماجی ایکتا پیدا کر سکتے ہیں۔

ملک کے سنجیدہ لوگ اس تحریک کو ملک کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ کسی ایک کے مجموعی کلچرل ڈھانچہ کو بدل کر نئے ڈھانچہ کا کلچر بنانا ایک نیا جھگڑا پیدا کرنا ہے۔ اس سے سماجی ایکتا ٹوٹتی ہے۔ اس طرح کی کسی کوشش سے کبھی سماجی ایکتا آنے والی نہیں۔

مگر مجھے اس تحریک میں کوئی خطرہ دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ فطرت سے لڑنا چاہتے ہیں اور فطرت سے لڑنے والے لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں کبھی اپنے نقشہ کو قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جو لوگ ملک کے کمپوزٹ کلچر کو بدلنے کی بات کرتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ کلچر ہمیشہ کمپوزٹ ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ خود وہ لوگ اگر بالفرض "انڈین کلچر" کے نام سے کوئی نیا کلچر رائج کر سکیں تو وہ بھی ایک کمپوزٹ کلچر ہی ہوگا۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ کسی ملک کا کلچر کبھی کسی دفتر میں یا کسی جلسہ گاہ میں نہیں بنتا وہ ہمیشہ لمبے سماجی عمل کے دوران بنتا ہے۔ کلچر ہمیشہ تاریخی پراسس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ کسی پولیٹکل رزولیوشن کا نتیجہ۔ میں کلچرل نیشنلزم یا یونی کلچرلزم کے نعرہ کو فطرت کے قوانین کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اور جو چیز فطرت کے قانون کے خلاف ہو اس کو ظہور میں لانے پر نہ کوئی پاور قادر ہے اور نہ کوئی سپر پاور۔

مزید یہ کہ یونی کلچر کی بات تنگ نظری کی بات ہے اور ملٹی کلچر کی بات وسعت نظری کی بات۔ مجھے یقین نہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ اتنے زیادہ نادان ہو سکتے ہیں کہ وہ وسعت نظری کے مقابلہ میں تنگ نظری کو ترجیح دیں۔

نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ ٹائمس آف انڈیا

کے سابق ایڈیٹر گری لال جین کی یاد میں بلائی گئی۔ موجودہ ایڈیٹر مسٹر دلیپ پڈگاؤنکر نے اس میں تقریر کرتے ہوئے جو بات کہی اس کو یہاں میں دہراؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ کسی انسان کی آئیڈنٹٹی ہمیشہ کئی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس کو آپ محدود روپ نہیں دے سکتے۔

انھوں نے کہا کہ میری آئیڈنٹٹی کا ایک پہلو یہ ہے کہ میں ایک خاص خاندان میں پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ایک خاص زبان میری مادری زبان بنی۔ میرے رہن سہن پر کچھ حالات کا اثر پڑا۔ میرے سماجی بیک گراونڈ سے میرا ایک مذہب بنا۔ میں باہر کے دیشوں میں گیا۔ اس نے بھی میرے اوپر کچھ اثرات ڈالے۔ اس قسم کی بہت سی چیزیں میری شخصیت کے اجزاء ہیں۔ اور انسانی شخصیت اتنی وسیع ہے کہ وہ بیک وقت بہت سے متضاد چیزوں کا احاطہ کر سکتی ہے :

I am large enough to contain all these contradictions

میں سمجھتا ہوں کہ یہ قول انڈیا کی اسپرٹ کو بلکہ وسیع تر معنی میں انسانیت کی اسپرٹ کو بتاتا ہے۔

کچھ لوگ یہ شکایت کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انڈیا کے لیڈروں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ آزادی کے بعد "ہندستانی" ملک کی زبان ہوگی جو فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ مگر آزادی کے بعد ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکایت کچھ زیادہ وقیع نہیں۔

زبان مشترک کلچر کا اہم حصہ ہے۔ زبان کو کوئی بناتا نہیں۔ زبان تاریخی عمل کے دوران اپنے آپ بنتی ہے۔ انڈیا میں مسلمان آئے تو وہ عربی، فارسی زبان لے آئے۔ اس وقت دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں ہریانی، پنجابی، کھڑی بولی، برج بھاشا، راجستھانی وغیرہ بولیاں رائج تھیں۔ ان بولیوں سے مسلمانوں کا میل جول بڑھا تو اس کے نتیجہ میں ایک ملی جلی زبان بننا شروع ہوئی۔ یہ زبان بعد کو ہندستانی کہلائی۔ یہ مشترک زبان ملکی اور غیر ملکی دونوں زبانوں کے الفاظ اور اسلوب کے ملنے سے بنی۔

یہ بیچ کی اور مشترک زبان آج بھی انڈیا کے بیشتر لوگوں کی زبان ہے۔ مسلمانوں کے لیے وہ گویا کہ آسان اردو ہے اور ہندو کے لیے وہ آسان ہندی۔ آج تمام بڑے بڑے ہندی اخبار جس زبان میں نکلتے ہیں وہ یہی ہندستانی زبان ہے جس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ اور جو انڈیا کے بیشتر لوگوں کے لیے آج بھی واحد قابل فہم زبان ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ کو شکایتی ذہن سے نہ لیں۔ بلکہ اسے وقت کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیں۔ وہ صرف یہ کریں کہ اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط بھی سیکھ لیں جو ان کے لیے نہایت آسان ہے۔ اس کے بعد انھیں معلوم ہوگا کہ مروجہ ملکی زبان عین وہی مطلوب زبان ہے جس کو وہ ہندستانی کے نام سے جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا یا انسانیت کا مستقبل کوئی شخص یا گروپ نہیں بناتا۔ قوم یا انسانیت کا مستقبل ہمیشہ تاریخ کی طاقتیں بناتی ہیں۔ اور انڈیا بلاشبہ اس معاملہ میں کوئی استثنائی کیس نہیں۔

قومی دھارا اور اقلیت

اقلیتیں اور قومی دھارا (Minorities in India and the national mainstream)

کا سوال ابھی بدستور ہندستان کے فکری ایجنڈے پر ہے۔ ہمارے تمام سنجیدہ دماغ اس پر لکھتے اور بولتے رہے ہیں۔ مگر پچاس سالہ ڈیبیٹ کے باوجود اس اہم ترین سوال کے بارہ میں ابھی تک فکری اتفاق رائے بھی نہ ہو سکا۔ کجا کہ عملی اعتبار سے اس کی جانب کوئی حقیقی پیش رفت ہوئی ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابھی تک ہم نقطہ آغاز متعین کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کا مستقبل سب سے زیادہ اسی سوال کے صحیح جواب پر منحصر ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر از سر نو مزید سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔ اور کم از کم نظری سطح پر کسی قابل عمل اسکیم تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ہم اس کی نظری بنیاد طے کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو یہ ہمارے لیے پچاس فی صد کامیابی کے ہم معنی ہوگا۔ اور اس پر یہ مقولہ صادق آئے گا کہ بہتر آغاز کا مطلب یہ ہے کہ آدھا کام ہو گیا :

Well begun is half done.

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں اقلیت اور اکثریت کے اختلافات نہایت شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اختلافات کے نتیجہ میں جو باہمی ٹکراؤ پیش آیا ہے اس سے ملک کو غیر معمولی نقصان پہنچا ہے۔ جب تک اس مسئلہ کا کوئی مناسب حل تلاش نہ کیا جائے ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ممکن نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان پرامن تعلقات قائم کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور اس کا ماڈل کیا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس معاملہ میں غور و فکر کے لیے ہمارے سامنے بنیادی طور پر دو ماڈل ہیں۔ ایک ماڈل وہ جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ دونوں فرقے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہنے کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرا ماڈل وہ جو اس نظریہ پر مبنی ہے کہ تمام اختلافات کو مٹا کر سب کو ایک بھارتی

نمونہ پر ڈھال دیا جائے۔ ان میں سے اول الذکر کو میں ملٹی کلچر ماڈل کہوں گا اور ثانی الذکر کو یونی کلچر ماڈل۔

انڈیا کے ابتدائی معماروں نے اس معاملہ میں جو ماڈل پیش کیا وہ وہی تھا جس کو میں نے ملٹی کلچر ماڈل کا نام دیا ہے۔ یہ ماڈل بقاءِ باہم (co-existence) کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ملک کے مختلف گروپ اپنے کلچرل تشخص کو باقی رکھتے ہوئے وسیع تر ملکی مفاد کی سطح پر ایک قوم بن جائیں۔

یہاں میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس ماڈل کو واقعہ بنانے کے لیے اس پولیٹکل گروپ کو ایک قیمت ادا کرنا تھا جس کو آزادی کے بعد ملک میں حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بدقسمتی سے یہ رولنگ گروپ یہ قیمت ادا کرنے میں ناکام رہا۔ اسی لیے یہ ماڈل، اپنی اصولی صحت کے باوجود، کامیاب نہ ہو سکا۔

وہ قیمت کیا تھی، وہ قیمت ایک لفظ میں تھی، فری اینڈ فیر الکشن۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد کسی بھی تعمیری کام کے لیے ملک میں یہ ماحول قائم کرنا ضروری تھا کہ یہاں کا ہر سیاسی گروہ یہ محسوس کرے کہ اقتدار کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے اور پر امن جمہوری ذرائع کو استعمال کرکے وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر رولنگ گروپ ایک بار اقتدار میں آنے کے بعد اس کا حریص ہو گیا کہ اس کا اقتدار ہمیشہ ملک میں باقی رہے۔

کوئی رولنگ گروپ جب ایسا چاہنے لگے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ غیر رولنگ طبقات کو دکھائی دینے لگتا ہے کہ امن اور آئین کے حدود میں رہ کر اقتدار تک پہنچنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب چونکہ جمہوری دور میں کوئی بھی شخص اپنی سیاسی محرومی پر راضی نہیں ہو سکتا، اس لیے اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج میں تخریبی سیاست کا ذہن پرورش پانے لگتا ہے۔

آزادی کے بعد انڈیا میں یہی ہوا۔ رولنگ گروپ کے باہر جو پولیٹکل عناصر تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ امن اور قانون کے حدود کی پابندی کرتے ہوئے وہ اقتدار تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے انھوں نے غیر آئینی طریقہ پر اقتدار تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ انڈیا جیسے نیم خواندہ ملک میں ان کے لیے اس مقصد کے حصول کا سب سے زیادہ آسان ذریعہ جذباتی سیاست تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر ۱۹۸۵ کے بعد نہایت شدت کے ساتھ "مندر۔مسجد" کے اشو کو

بھڑکایا۔ اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

اس دوسری سیاست کے فروغ ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں ملٹی کلچر کا ماڈل دب گیا اور اس کے بجائے ایک اور ماڈل ابھر کر سامنے آگیا۔ اس دوسرے ماڈل کو ایک لفظ میں یونی کلچر ماڈل کہا جاسکتا ہے۔ ملک کے باشعور طبقہ میں یہ دوسرا ماڈل اگرچہ کافی کنٹرورشیل رہا ہے۔ تاہم عوام کی سطح پر، خاص طور پر شمالی ہند میں، یونی کلچر ماڈل کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جمہوری نظام میں، خالص اصول کی بنیاد پر کسی کو اس سے روکا نہیں جاسکتا کہ وہ یونی کلچر ماڈل کی بات کرے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ عملی طور پر یہ ماڈل قابل عمل (feasible) نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نیچر کے خلاف ہے۔ وہ نیچرل لا کو بدلنے کے ہم معنی ہے، اور کوئی بھی طاقت نیچر کو بدلنے پر قادر نہیں ہوسکتی۔

تعدد (diversity) زندگی کا ایک ابدی قانون ہے۔ ایک گھر میں دس آدمی ہوں تو ہر آدمی کا مزاج الگ الگ ہوگا۔ ہر ایک کی پسند اور ناپسند جدا ہوگی۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر قوم کا ہے۔ قوم کے مختلف گروپ عین فطرت کے قانون کی بنا پر الگ الگ ذہن کے ہوتے ہیں۔ پھر کون انھیں بدل سکتا ہے۔ نیچر کو بلڈوز کرنا کسی بھی پاور یا سپر پاور کے لیے ممکن نہیں۔

جو لوگ "یونی کلچر" کے حامی ہیں، وہ خود بھی اس معاملہ میں تضاد فکری کا شکار ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں انڈیا میں یکساں کلچر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح برٹش ایمپائر کو اس ملک میں سو سال سے زیادہ مدت تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بھی ملک میں یکساں کلچر لانے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا کہ وہ پورے ملک کو ایک کلچرل رنگ میں رنگ دے۔

باہر کی دنیا میں بھی اس نوعیت کی تجرباتی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں امریکنائزیشن کی تحریک چلائی گئی۔ اس کا مقصد امریکہ میں بسنے والے مختلف کلچرل گروپ کو ایک امریکی کلچر میں رنگنا تھا۔ مگر یونی کلچرلزم کی یہ تحریک ساری کوشش کے باوجود امریکہ

ین فیل ہوگئی۔ آخر کار انھوں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ملٹی کلچر لزم کے اصول کو
اختیار کرلیا۔

ایسی حالت میں انڈیا کے یونی کلچرسٹوں کے پاس وہ کون سی خصوصی طاقت ہے جس کی بنا پر
وہ یقین رکھتے ہیں کہ نیچر سے لڑائی کے جس میدان میں دوسرے تمام لوگ ناکام ہو چکے ہیں،
اس میں وہ استثنائی طور پر کامیابی حاصل کرلیں گے۔

مزید یہ کہ یونی کلچر لزم کا یہ نظریہ اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے فائدہ ہے۔ کیونکہ ہمارا
مقصد یونی کلچر برائے یونی کلچر نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد سوشل ہارمنی یا نیشنل ہارمنی کا ماحول پیدا
کرنا ہے، اور اس مقصد کا کوئی تعلق یونی کلچر سے نہیں۔

اس کی ایک قریبی مثال ہندو اور سکھ کا معاملہ ہے۔ سکھ عملی طور پر ہندو ازم ہی کا ایک
حصہ تھے۔ چنانچہ پچھلے ساڑھے چار سو سال سے دونوں کا کلچر ہر اعتبار سے تقریباً ایک تھا۔ اس
کے باوجود دونوں میں زبردست اختلاف برپا ہوا جو ابھی تک دونوں کے درمیان خونیں ٹکراؤ
کی صورت میں جاری ہے۔ یونی کلچر اگر ہارمنی لانے کے لیے کافی ہوتا تو ہندو۔ سکھ مسئلہ کبھی
اس ملک میں پیدا نہ ہوتا۔

ایسی حالت میں ملک کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی (ہارمنی) لانے کا واحد ممکن طریقہ
یہ ہے کہ اس متفقہ اخلاقی اصول کو اختیار کرلیا جائے جس کو مغرب میں اختلاف پر اتفاق
(let us agree to disagree کا اصول کہا جاتا ہے) اور انڈیا میں بقاء باہم (co-existence)
ہے۔ اس کے مطابق، اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ
اختلاف کے باوجود مل کر رہنے کا آرٹ سیکھیں۔ وہ ایک دوسرے کا احترام (respect) کریں۔
وہ اختلافی پہلوؤں کو نظر انداز کریں اور صرف اتفاقی پہلوؤں پر زور دیں۔

یہ ایک طریق زندگی (way of life) ہے۔ اور ٹالرنس اسی طریق زندگی کا عنوان ہے۔
ٹالرنس ہی واحد بنیاد ہے جس پر کسی سماج میں ہارمنی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے سوا جو نظریے پیش
کیے جاتے ہیں وہ صرف خوب صورت الفاظ ہیں جو کبھی عمل میں آنے والے نہیں۔

انڈیا میں ایک بڑا سبق آموز ظاہرہ موجود ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ

سکھ اقلیت اگرچہ مجارٹی کمیونٹی کے کلچرل مین اسٹریم میں پوری طرح شامل تھی۔ اس کے باوجود سکھ اور ہندو کے درمیان خونیں ٹکراؤ پیش آیا۔ دوسری طرف اسی ملک میں کرسچین اور پارسی ہیں۔ وہ واضح طور پر اپنا علاحدہ کلچر رکھتے ہیں۔ مگر ان میں اور مجارٹی کمیونٹی میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

انڈیا میں کرسچین کی تعداد تقریباً ۳ فی صد ہے۔ پارسی اگرچہ بہت کم، یعنی مجموعی طور پر صرف ایک لاکھ ہیں۔ تاہم اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ ملک میں ایک قابل لحاظ کمیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کرسچین اور پارسی دونوں مذہبی اعتبار سے بند سماج (close society) ہیں۔ ان کا کیس کلچرل یکسانیت کا کیس نہیں بلکہ کلچرل انفرادیت کا کیس ہے۔ اس کے باوجود وہ نیشنل مین اسٹریم سے الگ نہیں سمجھے جاتے۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے پر غور کیجئے تو ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی گروپ خواہ جو عقیدہ بھی رکھے اور اپنے دائرہ میں جس طرح بھی رہے، اگر وہ دوسروں کے لیے نو پرابلم گروپ بنا ہوا ہو تو اس کے اور دوسروں کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔

کرسچین کمیونٹی کا معاملہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑے پیمانہ پر تعلیم گاہ، اسپتال اور دوسرے رفاہی کاموں میں لگا دیا ہے۔ وہ دوسروں سے ٹکراؤ کو آخری حد تک اوائڈ کرتے ہوئے اپنے اختیار کردہ دائرہ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی حال پارسی کمیونٹی کا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر صنعت اور تجارت کے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ ملک کے دوسرے طبقات سے ان کی نہ کوئی مانگ ہے اور نہ کوئی احتجاج۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کرسچین اور پارسی دونوں اس ملک میں اپنے آپ کو "نو پرابلم کمیونٹی" بنائے ہوئے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جو گروپ کسی سماج میں نو پرابلم گروپ بن کر رہے وہ اپنے آپ دوسروں کے لیے قابلِ قبول بن جاتا ہے۔

اب مسلم کمیونٹی کو لیجئے۔ اس وقت اصلاً سب سے بڑا مسئلہ مسلم مائناریٹی ہی کا ہے۔ کیونکہ ملک کی سب سے بڑی مائناریٹی ہونے کی بنا پر وہ نکسٹ ٹو مجارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ

ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خواہ گروپ کا مسئلہ ہو یا فرد کا، مسٹر فرسٹ اور مسٹر نکسٹ کے درمیان ہمیشہ کچھ نہ کچھ رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا واحد قابل عمل حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسٹر نکسٹ مسٹر نو پرابلم بن جائے۔

مسلم کمیونٹی اور مجارٹی کمیونٹی کے درمیان پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے مسلسل کش مکش جاری ہے۔ اس کش مکش نے مختلف صورتوں میں ملک کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے۔ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس کا سبب صرف ایک ملے گا، اور وہ ہے — مسلم کمیونٹی کا پرابلم کمیونٹی کی صورت اختیار کر لینا۔

اس معاملہ کو مزید گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندو۔مسلم مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی ہے جو ہندو۔سکھ مسئلہ ہے۔ ہندو اور سکھ اس ملک میں پچھلے ساڑھے چار سو سال سے مل جل کر رہ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مگر ۲۰ سال پہلے سکھوں نے علاحدہ سکھ اسٹیٹ کی تحریک اٹھائی اور پھر اس کو وہ تشدد کی حد تک لے گئے۔ اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا۔

اس فرق کی وجہ سادہ طور پر صرف یہ تھی کہ خالصتان تحریک سے پہلے سکھ کمیونٹی اس ملک میں گویا نو پرابلم کمیونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس پر تشدد تحریک کے بعد وہ ایک پرابلم کمیونٹی بن گئی۔ اور پرابلم گروپ ایک گھر کے اندر بھی برداشت نہیں کیا جاتا، پھر وہ پورے ملک میں کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلم لیڈروں کی تقسیم ملک کی تحریک جو اربعینات میں شدت کے ساتھ اٹھی، اس سے پہلے اس ملک میں ہندو اور مسلمان پوری طرح مل جل کر رہتے تھے۔ دونوں میں فرقہ وارانہ سطح پر کوئی قابل ذکر کش مکش موجود نہ تھی۔ لیکن پرشور دو قومی تحریک اور اس کے بعد ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارہ نے اس ملک کے مسلمانوں کو اہل ملک کی نظر میں ایک پرابلم کمیونٹی بنا دیا۔ یہی واحد سبب ہے جس کے نتیجہ میں ہندو اور مسلمان کا وہ مسئلہ انڈیا میں پیدا ہوا جس کے کڑوے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اوپر کے تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ انڈیا کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی لانے کے لیے

ملٹی کلچر ماڈل ہی واحد درست ماڈل ہے۔ کامیابی کے امکانات بھی صرف اسی کے لیے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کی موافقت صرف اسی کے ساتھ ہے۔ تاہم اس کی کامیابی کی ایک لازمی شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ مائناریٹی کمیونٹی اس کے قیام کے لیے اپنا ضروری تعاون دے۔ اور اس کا تعاون یہ ہے کہ وہ ملک میں نوپرابلم کمیونٹی بن کر رہنے لگے۔ اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو اس کے بعد کوئی بھی چیز ملک میں ہارمنی کا ماحول پیدا کرنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

مسلمان اگر اس ملک میں نوپرابلم کمیونٹی بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں تو یہ ان کے لیے اپنے مذہب سے انحراف نہیں ہوگا بلکہ عین اپنے مذہب پر عمل کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے پرابلم کمیونٹی بننا اپنے مذہب سے انحراف تھا، اور نوپرابلم کمیونٹی بننا ان کے لیے اپنے مذہب کی طرف واپسی کے ہم معنی ہوگا۔ یہاں اس سلسلہ میں بطور مثال اسلام کے چند متعلق (relevant) حوالے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب مکہ میں آپ کے حامی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کو نئے حامی کی ضرورت تھی جس کی حمایت کے تحت آپ نبوت و رسالت کا کام جاری رکھیں آپ مختلف عرب قبائل کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو۔ اس سلسلہ میں جو تفصیلات سیرت کی کتابوں میں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایک قبیلہ سے ملے۔ اس سے جب آپ نے اپنی ضرورت بیان کی تو اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں صرف اعلانِ رسالت کا کام کروں گا۔ اور تم میں سے کسی شخص کو کسی ناپسندیدہ چیز پر مجبور نہیں کروں گا (ولا أكره أحداً منكم على شيئ)

اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہی ہوگی کہ میں تمہارے لیے کوئی پرابلم نہیں پیدا کروں گا۔ میں تمہارے درمیان ایک نوپرابلم انسان بن کر رہوں گا۔

قدیم مکہ میں کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر قرآن میں پہلی آیت اتری تو اس میں کعبہ کے بتوں کے مسئلہ کا کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔ پہلا حکم جو قرآن میں دیا گیا وہ یہ تھا کہ اقرأ (پڑھ) اس کا مطلب یہ ہے کہ دور اول میں تطہیر مسجد کو اشو بنانے کے بجائے حصول علم کو اشو بنایا گیا۔ اس کے مطابق، موجودہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مسجد کی "بے حرمتی" کو اپنا اشو نہ بنائیں،

بلکہ ایجوکیشن کو اپنا اشو بنائیں۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں مکہ کے لوگ بت پرست تھے۔ مگر پیغمبر نے ان کو بت پرست یا کافر کے لفظ سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ اے میری قوم۔ اس سنت رسول کے مطابق مسلمانوں کو بھی انڈیا کے ہندوؤں کو اپنی قوم سمجھنا چاہیے اور ان کے ساتھ بھائی جیسا معاملہ کرنا چاہیے۔

پیغمبر اسلام نے راستہ سے رکاوٹ ہٹانے کو ایمان کی علامت بتایا ہے (اماطة الاذی عن الطریق) ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس پر احتجاج کرنے کی کیا ضرورت کہ شہر کی مصروف سڑک پر نماز پڑھنے سے انھیں منع کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کی تعلیم اسلام میں بہت پہلے سے موجود ہے۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق رض کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا تو انھوں نے باقاعدہ تحریر کی صورت میں وہاں کے مسیحیوں کو یہ اجازت دی کہ وہ یروشلم کی مسجد کے سامنے سے اپنا جلوس نکالیں۔ پھر ہندستان کے ہندو اگر یہاں کسی مسجد کے سامنے سے اپنا جلوس لے کر گزریں تو اس پر مسلمان کیوں اعتراض کریں اور کیوں ان کا جلوس روکنے کی کوشش کریں۔

پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ کہا جاتا ہے۔ وہاں حکومت کی طرف سے فیملی پلاننگ کی اسکیم چلائی جارہی ہے۔ پاکستانی اخباروں میں مسلسل "خاندانی منصوبہ بندی" کے اشتہارات حکومت کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں۔ وہاں محکمہ ڈاک کی طرف سے ایسے لفافے چھاپے گئے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا رہتا ہے: "چھوٹا خاندان زندگی آسان"۔ پھر انڈیا میں حکومت اگر اس قسم کی تحریک چلائے تو مسلمانوں کو اسے خطرہ سمجھنے اور اس پر ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت۔

سعودی عرب میں اور دوسرے اسلامی ملکوں میں استثنائی حالت میں مسجدیں ری لوکیٹ کی گئی ہیں۔ ایسی حالت میں انڈیا میں اگر استثنائی طور پر یا اضطرار کے حالات میں دفع شر کے لیے ایسا کوئی واقعہ ہو تو یہاں کے مسلمان اس کو اپنے لیے خطرہ کیوں سمجھیں۔

عرب ملکوں میں مسجدوں کے اندر جلسہ اور تقریر کی اجازت نہیں۔ حتی کہ نماز کے مخصوص اوقات کے علاوہ مسجد میں عبادت اور تلاوت کی بھی اجازت نہیں۔ ایسی حالت میں اگر انڈیا میں گنجان محلہ میں واقع مسجدوں میں رات کے وقت لاوڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی لگائی

جائے تو اس پر انھیں شور و غوغا کرنے کی کیا ضرورت۔

اسلام امن کو پسند کرتا ہے نہ کہ ٹکراؤ کو۔ حدیبیہ کے معاہدہ میں پیغمبر اسلام نے اپنے حریف کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر ان کے ساتھ پیس ایگریمنٹ کر لیا۔ اب مسلمانوں کو بھی اپنے پیغمبر کی پیروی میں یہی کرنا ہے کہ وہ مسائل کو نظر انداز کریں۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ امن کو سپریم بنائیں نہ کہ ملی وقار کو۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو انڈیا میں وہ نمبر ۱ کمیونٹی بن جائیں گے۔ اور اس کے بعد موجودہ غیر ضروری مسائل بھی اپنے آپ ختم ہو جائیں گے

اس سلسلہ میں ایک چشم کشا مثال (telling example) ہے جو یہاں قابل ذکر ہے دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳) نے اے این آئی (ANI) کے حوالے بتایا ہے کہ پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک ہے۔ یہ بات ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوئی۔ یہ جائزہ بڑے بڑے تاجروں کے درمیان کرایا گیا ہے جن کا تعلق تمام براعظموں سے ہے۔ مختلف ملکوں کے بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں سے عالمی اقتصادی فورم نے یہ پوچھا تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق مختلف ملکوں کے بارہ میں بتائیں کہ کس ملک میں جان اور مال کے تحفظ کے اعتبار سے کیا حالت ہے۔ اس جائزہ میں پاکستان کا مقام سب سے نیچے تھا، جب کہ سنگاپور کو سب سے زیادہ محفوظ علاقہ پایا گیا :

Pakistan happens to be the unsafest country in the world, according to a recent survey conducted among the business and economic leaders belonging to all the continents. The leaders of the business and industry of various countries were asked by the World Economic Forum to rate various countries according to their perceptions about the safety of life and property in those countries. Pakistan touched the bottom whereas Singapore was found to be the safest place

جیسا کہ معلوم ہے، پاکستان ایک قوم کے نعرہ پر بنا، وہاں تمام باشندوں کا ایک مذہب اور ایک زبان ہے۔ سب کی ایک تاریخ ہے اور سب کا ایک پروج ہے۔ گویا سارے ملک کا ایک پاکستانی کلچر ہے۔ اس کے باوجود وہاں اتنے زیادہ دنگے اور فساد ہوتے ہیں کہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک بن گیا ہے۔

دوسری طرف سنگاپور میں چار سرکاری زبانیں ہیں ---- چینی، مالے، ٹمل، انگلش۔ وہا

بدھسٹ، مسلم، ہندو، کرسچین سب اپنے اپنے مذہب اور کلچر کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود سنگاپور دنیا کا سب سے زیادہ محفوظ ملک ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ قومی ایکتا کا کچھ بھی تعلق کلچرل ایکتا سے نہیں۔

خلاصہ

انڈیا کی اقلیتوں کو مین اسٹریم میں لانے کے لیے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ملک میں کمیونل ہارمنی پیدا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ یہاں ملٹی کلچر ماڈل کو اختیار کر لیا جائے۔ اس ماڈل کو عملی طور پر قائم کرنے کے لیے ہر فریق کو ایک قیمت ادا کرنا ہے۔

رولنگ گروپ کو یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ وہ الکشن پر اس کو فری اور فیر صورت میں جاری رکھے۔ ہارنے والی پارٹی اپنی ہار کو مان کر جیتنے والے گروپ کو گورنمنٹ چلانے کا موقع دے، تاکہ ملک میں تخریبی سیاست کی پرورش نہ ہو سکے۔

مجاریٹی کمیونٹی کو یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ یونی کلچر کا ماڈل قابل عمل نہیں۔ قابل عمل ماڈل وہی ہے جو ملٹی کلچر کے اصول پر مبنی ہے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی مفید بھی۔

مائناریٹی کمیونٹی، خاص طور پر سکھ اور مسلمان کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے اور ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے ہم آہنگی کے طریقہ کو اختیار کریں گے اور شعوری طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ اس ملک میں انھیں نو پرابلم کمیونٹی بن کر رہنا ہے۔

اگر ملٹی کلچر ماڈل کو سنجیدہ طور پر قبول کر لیا جائے، اور ہر متعلق فریق اس کے لیے ضروری قیمت بھی ادا کرے تو اس کے بعد بلا تاخیر ملک میں امن اور ہم آہنگی کا ماحول قائم ہو جائے گا اور ملک تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گا اور جب ایک بار صحیح سمت میں سفر شروع ہو جائے تو وہ ضرور اپنی مطلوب منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

ہندتو کے بارہ میں

خطرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی خطرہ، اور دوسرا فرضی خطرہ۔ اگر حقیقی خطرہ درپیش تو اس کا حل یہ ہے کہ آدمی اس کی نوعیت کو سمجھے اور اس کے مطابق بچاؤ کی ضروری تدبیر کرے۔ لیکن اگر خطرہ محض فرضی ہو تو مسئلہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس سے بچاؤ کی تدبیر صرف یہ ہوتی ہے کہ کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرضی خطرہ کو نظر انداز کر دینا ہی اس سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔

ہندتو کا خطرہ راقم الحروف کے نزدیک محض فرضی خطرہ ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل ہندتو کا کافی چرچا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کا انڈیا ہندتو بنیاد پر تشکیل دیا جائے گا۔ مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے، خود ہندتو کے علم برداروں کے ذہن میں کا کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اور جس چیز کا نقشہ ہی اب تک واضح طور پر متعین نہ ہوا ہو، انڈیا کے مستقبل کی تشکیل کرنے والا کس طرح بنے گا۔

مسٹر لال کرشن آڈوانی کے الفاظ میں، ہندتو سے مراد کلچرل نیشنلزم (cultural nationalism) ہے۔ یعنی کلچر پر مبنی قومیت۔ وہ کون سا کلچر ہوگا جس پر یہ قومیت تشکیل دی جائے گی۔ اس کا جواب مسٹر جے دوباشی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انڈیا میں قومی تشخص صرف ہندو ہی ہو سکتا ہے :

In India, the national identity can only be Hindu (The Illustrated Weekly of India, March 12, 1993)

اس کے ساتھ مسٹر گری لال جین کے الفاظ ملا لیجئے تو بات مکمل ہو جائے گی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۳) میں خاص اسی موضوع پر مسٹر جین کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

Apartheid in reverse – Dangers of minorityism

مضمون نگار کے نزدیک انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کے کلچر کو اختیار کر لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انڈیا کوئی انسانی چڑیا خانہ نہیں ہے جس میں مختلف انسانی انواع

ایک مقام پر الگ الگ خانوں میں رکھ دی گئی ہوں اور ان کو ایک نہ کیا جا سکتا ہو۔ انڈیا ممتاز طور پر اور ہزاروں سال سے ایک یکساں کلچر کا ملک ہے اگرچہ وہ یک سنگی نہیں :

India is not a human zoo with different species of humanity put together in one physical location in separate enclosures and it cannot be turned into one. It embodies a remarkably homogenous, though not monolithic, culture going back thousands of years. (p.8)

غیر ہندو فرقے اگر ہندتو کے علم برداروں کے اس مطالبہ کو بلا بحث مان لیں تب بھی اصل مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یکساں کلچر کو اختیار کرنے کے لیے اس کا ایک ماڈل ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ ایسا کوئی ماڈل سرے سے ملک کے اندر موجود ہی نہیں۔ اور جب ماڈل موجود نہ ہو تو اس کی پیروی کس طرح کی جائے گی۔

وہ چیز جس کو یہ حضرات ہندو کلچر یا بھارتی کلچر کہتے ہیں، وہ بروقت کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے۔ اس میں بیک وقت بے شمار خدا ہے۔ بابری مسجد کو ڈھانے والے بھارتی کلچر کے نمائندوں نے پُرفخر طور پر اجودھیا میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ : ایک طرف ۳۳ کرور، ایک طرف ایک اللہ۔ اسی طرح ہندوؤں میں زبان، کھانا، کپڑا، رہن سہن، ہر چیز میں اختلاف ہے۔ حتی کہ ایک ہندو مبصر کے الفاظ میں، اس ملک میں جتنے ہندو ہیں، اتنی ہی ان کی قسمیں ہیں۔

جب ہندو کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کون ہندو ہے جس کو پیروی کے لیے ماڈل سمجھا جائے۔ کیا وہ ہندو جو کوٹ اور پتلون پہنتا ہے یا وہ ہندو جو دھوتی اور کرتا پہنتا ہے۔ وہ ہندو جو مورتی پوجا کرتا ہے یا وہ ہندو جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتا ہے۔ وہ ہندو جو آستک ہے یا وہ ہندو جو ناستک ہے۔ وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو تاریخ کہتا ہے یا وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو افسانہ (متھ) سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو شاکھاہاری ہے یا وہ ہندو جو منساہاری ہے۔ وہ ہندو جو ہندوازم کو مذہب بتاتا ہے یا وہ ہندو جو ہندوازم کو فلاسفی قرار دیتا ہے وہ ہندو جو رام کو ہیرو مانتا ہے یا وہ ہندو جو راون کو ہیرو سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو اونچ ذات اور نیچ ذات میں یقین رکھتا ہے یا وہ ہندو جو ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

اس قسم کے بے شمار فرق ہیں جو ایک ہندو اور دوسرے ہندو کے درمیان پائے جاتے ہیں

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سا ہندو ہے جو ہندو ازم یا ہندو کلچر کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں "ہندتو" کے علم برداروں کو پہلے خود ہندوؤں کے اوپر اپنا بلڈوزر چلاکر انھیں ایک کلچر یا یکساں کلچر کا نمونہ بنانا چاہیے۔ اس کے بعد غیر ہندو فرقوں سے یہ مانگ کرنا چاہیے کہ وہ اس "ماڈل ہندو" کی پیروی کریں۔ اور اپنے کلچر کو اس کے مطابق بنائیں۔

ہندتو کے علم برداروں کو پہلے یہ کرنا ہے کہ ہندو کلچر کے ناقابلِ شمار اختلافات کو ختم کرکے اس کو ایک واحد اور یکساں کلچر بنائیں تاکہ دوسرے فرقوں کے لیے مطلوب یکساں کلچر کا ایک واضح اور متعین ماڈل سامنے آجائے اور لوگوں کے لیے اس کی پیروی قابل عمل ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مسٹر گری لال جین کے الفاظ خود ہندو فرقہ پر زیادہ بڑے پیمانہ پر صادق آتے ہیں۔ ہندو فرقہ خود ایک بہت بڑا ہیومن زو ہے۔ اپنے موجودہ تنوعات کے ساتھ ہندو فرقہ کے لیے یکساں کلچر کا نمونہ بننا ممکن نہیں۔ وہ تنوع کلچر (composite culture) کا ماڈل یقیناً ہے مگر وہ یکساں کلچر کا ماڈل ہرگز نہیں۔

ہندتو کی اس کمزوری کا اعتراف خود ہندتو کے علم برداروں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہندو کی مشترک تعریف کے لیے کوئی واضح بنیاد موجودہ حالت میں موجود نہیں۔ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہندو، عمومی اعتبار سے، سب سے پہلے ایک ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد ہی وہ ہندو برادری کا حصہ بنتا ہے :

A Hindu, generally speaking, belongs to a caste before he belongs to the Hindu fraternity.

مسٹر گری لال جین (۱۹۹۳-۱۹۲۲) نے اپنے ایک مفصل مضمون میں لکھا تھا کہ ہندو قومیت کی دو قسمیں ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی ہندو قومیت درجات کے فرق کے ساتھ محض مسلم مخالف جذبہ پر قائم ہے۔ مثبت ہندو قومیت کا تعلق ایک ہندو تشخص کے لیے اپیل کرنے پر ہے۔ مگر چوں کہ یہ تشخص ہندوؤں کے درمیان داخلی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے غیر واقعی ہے اس لیے مثبت ہندو قومیت وجود میں آنے کے قابل نہیں۔ اس طرح جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں :

There are two types of Hindu communalism: negative and positive. Negative Hindu communalism consists in being merely anti-Muslim in varying degrees: positive Hindu communalism consists in appealing in the name of a Hindu identity. But since this identity is very shadowy due to Hindu's lack of internal homogeneity, positive Hindu communalism is not viable. Thus what is possible is not desirable and what is desirable is not possible. (The Times of India, New Delhi, July 4, 1987)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند تو خود اپنے اندرونی مسائل میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کے لیے بیرونی خطرہ بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ہندتو بیرونی خطرہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب کہ مسلمان جوش اور ہنگامہ والی سیاست سے اس کو اینٹی مسلم احساس پر کھڑے ہونے کا موقع دے دیں۔ اگر مسلمان ٹکراؤ سے اعراض کی پالیسی اختیار کرلیں تو ہندتو اپنے قیام کی واحد بنیاد سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا جو انجام ہوگا اس کو لفظوں میں بتانے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ایک محکم اصول یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک بے معنی نعرہ لگا رہے ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان نعروں کو نظرانداز کرکے یہ دیکھیں کہ تاریخ کی طاقتیں کس طرف جا رہی ہیں۔ کیوں کہ زندگی میں بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ تاریخ کی طاقتیں ہیں نہ کہ کچھ غیر سنجیدہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ۔

اس سلسلہ میں میں امریکہ اور کناڈا کی مثال دوں گا۔ ان ملکوں میں بھی، انڈیا کی طرح، مختلف کلچر پائے جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کچھ انتہا پسند لیڈر اٹھے۔ انھوں نے مختلف کلچر کو ختم کرکے ایک کلچر بنانے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کو عام طور پر یونی کلچرلزم (uniculturalism) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر کار انھیں ماننا پڑا کہ ان کے ملک کے لیے قابل عمل چیز صرف متنوع کلچریت (multiculturalism) ہے نہ کہ واحد کلچر۔

یہی واقعہ یقینی طور پر انڈیا میں بھی ہونے والا ہے۔ واحد کلچر کا نعرہ لگانے والے یہاں ناکام ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی وہ مختلف اور متنوع کلچر کا اصول ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں موجود تھا اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔

نئی دہلی میں ۲۵ جولائی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی میں چھپ چکی ہے۔ یہاں مختلف ہندو دانش وروں نے تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر

دلیپ پڈگاؤنکر (Dileep Padgaonkar) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں ہر آدمی کی مختلف حیثیت ہوتی ہے۔ آپ اس قانون قدرت کو بدل نہیں سکتے۔ اس معاملہ میں ہمیں تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ میں مہاراشٹر میں پیدا ہوا۔ اب میں دہلی میں رہتا ہوں۔ وطن، زبان، مذہب، تہذیب، تعلیم ہر لحاظ سے میری مختلف حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے اعتبار سے میری مختلف حیثیت ہے۔ میری زندگی میں قدیم بھارتی عہد کا حصہ ہے۔ پھر میری زندگی پر مسلمانوں کے ہزار سالہ عہد کی چھاپ ہے۔ اس کے بعد برٹش عہد آیا۔ اس نے بھی میری زندگی پر اثرات ڈالے۔ اب میں آزاد انڈیا کا ایک فرد ہوں۔ یہ ساری چیزیں میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی میں اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے مشہور انگلش رائٹر والٹ وھٹمین (Walt Whitman) کا قول دہرایا اور کہا کہ ہمیں ان تمام تضادات کے ساتھ جینا ہے۔ میں اس سے زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنی زندگی میں سمو سکوں:

We all have to live with our contradictions. I am large enough to contain all these contradictions.

والٹ وھٹمین (۱۸۹۲-۱۸۱۹) کا یہ قول زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ انسان تضادات کا مجموعہ ہے اور تضادات سے نباہ کر کے ہی وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

انڈین کلچر اور انڈین ہسٹری کے مشہور عالم پنڈت بی این پانڈے (۸۸ سال) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ ان سے یہ انٹرویو مسٹر ایس کالی داس نے لیا ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل یہ ہے کہ آج کا ہندو ہمارے دھرم کی مقدس کتابوں سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ اتھرووید میں ہے کہ یہ دیش کئی مذہبوں، کئی نسلوں، کئی ذاتوں، کئی زبانوں کا دیش ہے۔ اس کے اندر مزید یہ کہا گیا ہے کہ اس دیش کو مل کر رہنے کے لیے ایک اصول کو مان لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ یہ سرزمین ہماری مادر وطن ہے اور ہم سب اس کی سنتان ہیں۔ اس طرح پانچ ہزار سال پہلے ہم اس اصول پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس دیس میں زبان، عقیدہ اور کلچر کے اختلاف کے باوجود ہم پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے:

The trouble is that today's Hindutva has little in common with the Dharma of our scriptures. The Atharva Veda says: "This is a country of many religions, many ethnicities, many castes, many languages." It further says that to co-exist the people of this country must agree on one principle: "This land is our mother and all of us are her progeny." So even 5000 years ago we had agreed on the principles of peaceful co-existence in a clime of diversity in language, creed and culture.

انڈین کلچر کے بارہ میں یہی صحیح نقطۂ نظر ہے اور آخر کار ہمارے ملک میں یہی باقی رہنے والا ہے۔ انڈیا ماضی میں ملٹی کلچر کا ملک تھا، حال میں وہ ملٹی کلچر کا ملک ہے، اور مستقبل میں بھی وہ ملٹی کلچر کا ملک رہے گا۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے، اور اسی میں ملک کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف نعرہ بازی ہے، نہ کہ کوئی واقعی نظریہ یا کوئی حقیقی سیاست۔

الرسالہ کیسٹ — ارکانِ اسلام سیٹ

اس وقت ارکانِ اسلام کے نام سے کیسٹوں کا ایک سیٹ زیرِ تیاری ہے۔ جس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔ حقیقتِ ایمان

۲۔ حقیقتِ نماز

۳۔ حقیقتِ روزہ

۴۔ حقیقتِ زکاۃ

۵۔ حقیقتِ حج

ایمان کے موضوع پر ابتدا ہی میں ایک کیسٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ اب بقیہ چار موضوعات پر علاحدہ علاحدہ کیسٹ بنائے جا رہے ہیں جن میں عام فہم انداز میں اسلامی عبادات کی حقیقت اور ان کے تربیتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ پورا سیٹ جلد ہی تیار ہو جائے گا۔

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ □ ہدیہ فی سیٹ ۱۱۰ روپیہ

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

مواقع موجود ہیں

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کا اخبار آیا تو اس میں صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان بمبئی میں ہونے والا کرکٹ میچ کینسل کر دیا گیا ہے :

Bombay Cricket match cancelled.

ٹائمس آف انڈیا (۲۵ اکتوبر) کے الفاظ میں خبر کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک دن کے لیے ہونے والا انٹرنیشنل کرکٹ میچ جو بمبئی میں ۲۸ اکتوبر کو ہونے والا تھا اس کو کینسل کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میچ ہونے کی صورت میں شیوسینا نے بمبئی بند کی دھمکی دی تھی :

The one-day international cricket match between India and Pakistan scheduled to be played in Bombay on October 28 was cancelled after the Pakistan team declined to play. The Shiv Sena had threatened a Bombay bandh if the match went ahead.

یہ خبر اخبارات میں چھپی تو ایک مسلمان میرے پاس آئے۔ انھوں نے شکایت کی کہ انڈیا میں ہندو فرقہ پرستی بہت طاقت ور ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس نے بمبئی میں ہونے والے انڈیا۔ پاکستان کرکٹ میچ کو رکوا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ مذکورہ خبر کا ایک حصہ ہے۔ اسی کے ساتھ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب یہ میچ بنگلور یا گوالیار یا مدراس میں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں "بمبئی" اگر ایک ہے تو "غیر بمبئی" تین ہیں۔ ملک کے ایک مقام پر اگر حالات موافق نہیں ہیں تو اسی ملک میں اور بہت سی جگہیں ہیں جہاں آپ کے لیے حالات پوری طرح موافق ہیں۔ پھر کیوں آپ صرف ایک پہلو کو دیکھ رہے ہیں، دوسرا پہلو آپ کیوں نہیں دیکھتے۔

پھر میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً مکہ میں اپنا کام شروع کیا۔ وہاں آپ کو سخت مشکلات پیش آئیں۔ مگر آپ شکایت اور احتجاج میں نہیں پڑے۔ آپ نے کہا کہ اگر میرے مخالفین مکہ میں مجھے کام نہیں کرنے دیتے تو مدینہ میں میرے لیے کام کرنے کے مواقع ہیں۔ میں وہاں جا کر اپنا کام کروں گا۔ چنانچہ آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ وہاں آپ کا کام اتنا بڑھا کہ مکہ سمیت پورے ملک میں انقلاب آگیا۔ گویا اب بھی آپ کو وہ پوزیشن حاصل ہے جو بوقت ہجرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ پھر شکایت کس لیے۔

زندگی میں ہمیشہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ مائنس پوائنٹ بھی اور پلس پوائنٹ بھی۔ آدمی اکثر یہ غلطی کرتا ہے کہ وہ مائنس پوائنٹ میں اس طرح الجھتا ہے کہ پلس پوائنٹ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ جو لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہوں وہی اس دنیا میں ناکام رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اس کمزوری سے اوپر اٹھ جائیں وہ ہمیشہ کامیابی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔

اس دنیا کو خدا نے مقابلہ (competition) کی بنیاد پر بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ ہر ایک کے لیے مشکلات رہیں گی۔ مگر اسی کے ساتھ قرآن میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ دنیا میں مشکلات کے ساتھ آسانیاں بھی لازمی طور پر موجود رہیں گی۔

ایسی حالت میں اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے راستے میں بعض مشکلات ہیں۔ اس کے بجائے زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مشکلات کے باوجود یہاں آسانیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی ناموافق حالات (disadvantage) کے ساتھ موافق حالات (advantage) بھی یکساں طور پر بلکہ اکثر حالات میں زیادہ مقدار میں موجود ہیں۔

یہ اصول جس طرح تمام دوسرے ممالک پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح وہ انڈیا پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ انڈیا یقینی طور پر اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ صرف دیکھنے والوں کے زاویۂ نگاہ کا فرق ہے کہ وہ اس کو دیکھ نہیں پاتے۔

مسلم مسئلہ

ہندستان میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی وہ تحریکیں ہیں جو ایجی ٹیشن کے اصول پر چلائی جاتی ہے۔ یہاں کے مسلمان اپنے لیڈروں کی رہ نمائی میں پچھلے پچاس سال سے احتجاجی سیاست چلا رہے ہیں۔ کبھی مسلم یونی ورسٹی کے نام پر، کبھی مسلم پرسنل لا کے نام پر، کبھی بابری مسجد کے نام پر۔ اس قسم کی احتجاجی تحریکوں نے اس ملک میں ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑ دیا ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر تناؤ اور اشتعال کی حالت پیدا کر دی ہے۔ اور جہاں اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جائے وہاں اقلیتی فرقہ کبھی امن اور حفاظت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

کسی شخص نے مشرقی ملکوں کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے یہاں جلوس

کی سیاسی سرگرمیوں اور عوامی جلسوں نے گرمی زیادہ پیدا کی ہے اور روشنی کم :

Political activities of procession and public meeting have generated more heat than light.

یہ الفاظ ہندستانی مسلمانوں کی سیاست پر مکمل طور پر صادق آتے ہیں۔ یہاں کے مسلم لیڈروں نے ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک یہی کیا کہ وہ احتجاج اور ایجی ٹیشن کے اصول پر اپنی تحریکیں چلاتے رہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ان کی تحریکوں نے صرف باہمی ناخوش گواری میں اضافہ کیا۔ ان تحریکوں سے باہمی ہمدردی کا ماحول پیدا نہ ہو سکا۔

ان نام نہاد مسلم لیڈروں نے صرف یہ جانا کہ احتجاجی تحریک چلانا ان کا قانونی حق ہے۔ مگر وہ یہ جان نہ سکے کہ عملی صورت حال ان کے موافق نہیں ہے۔ چنانچہ اس منفی سیاست نے ان کو صرف نقصان پہنچایا۔ اس کے ذریعہ وہ کوئی مثبت فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں اس قانونی حق کا استعمال مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کر سکا کہ جو کچھ حاصل نہیں تھا، اس کو پانے کی کوشش میں جو حاصل تھا وہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

ہندستان کے مسلمانوں کے مسائل کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ وہ جس طرح باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں اور وہاں کے حالات سے موافقت کر کے رہتے ہیں، اسی طرح وہ ہندستان کے حالات سے موافقت کر کے رہنے لگیں۔ اس کے بعد انھیں اس ملک میں امن، عزت، حفاظت، سب کچھ اسی طرح مل جائے گا جس طرح وہ ان چیزوں کو باہر کے مسلم یا غیر مسلم ملکوں میں کامل طور پر پائے ہوئے ہیں۔

تشخص کا مسئلہ

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۲ مئی ۱۹۹۲) میں مسٹر وسنتھا پاتری (Vasantha R. Patri) کا ایک تجزیہ چھپا ہے۔ موضوع کے مطابق، اس کا عنوان ہے ـــــــ لاس اینجلیز کے فسادات، افسانہ بکھر گیا :

Los Angeles riots: Myth lies shattered

یہ مضمون امریکہ کے نسلی فسادات کے بارہ میں ہے۔ اپریل۔مئی ۱۹۹۲ میں یہ فسادات اولاً لاس اینجلیز میں ہوئے اور پھر کئی امریکی شہروں میں پھیل گئے۔ ان میں پچاس آدمی مر گئے۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ کروروں روپیہ کی جائداد تباہ ہوئی، آخر کار فوج نے آکر ان کو دبا دیا۔

۱۶۱۹ء میں امریکہ میں افریقہ کی سیاہ فام نسل کے لوگ بطور زرعی غلام کے لائے گئے تھے۔ یہ لوگ یہاں بس گئے۔ ان کی اولادیں ہوئیں، مگر امریکہ میں انھیں برابر کے شہری حقوق حاصل نہ ہو سکے۔ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر جو ایک تعلیم یافتہ نیگرو تھے، ان کی قیادت میں ۱۹۶۰ میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلی۔ اب اگرچہ قانونی طور پر امریکہ کی سیاہ فام نسل کو برابر کے شہری حقوق دیے گئے ہیں، مگر عملاً یہ حق انھیں حاصل نہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان مسلسل بے چینی موجود رہتی ہے۔ اسی کا ایک شدید اظہار پچھلے فساد میں اس وقت ہوا جب کہ لاس اینجلیز کے ایک سفید فام ڈرائیور نے ایک سیاہ فام ڈرائیور کو سڑک پر مارا۔

مضمون نگار نے اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہندستان کے انتہاپسندوں کے لیے بھی بے حد قابل توجہ ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ برابر یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر سیاہ فام نسل کو سفید فام نسل میں شامل کرے جس میں ہر آدمی سفید فام امریکی نقشہ میں ڈھل جائے۔ مگر حالیہ فساد نے اس نقطۂ نظر کی ناکامی کو ثابت کر دیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ تہذیبی تنوع کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نسلی امتیاز کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہی دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند جمہوریت میں یک جہتی لانے کی واحد ضمانت ہے :

America has all along attempted a one-way assimilation, whereby everyone could be shaped into the Anglo-mould. From the latest manifestation of the failure of this approach a shift in emphasis can be considered. Encouraging cultural pluralism and active prevention of ethnic discrimination alone can ensure the integration of the world's richest democracy. (p.13)

مضمون نگار کا یہ تبصرہ ہندستان کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا امریکہ کے لیے۔ اگرچہ دولت اور طاقت کے اعتبار سے دونوں ملکوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ تاہم جہاں تک مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے، وہ دونوں جگہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

ہندستان میں بھی ایک طبقہ ہے جو اسی ڈھنگ پر سوچتا ہے جس طرح امریکہ کے سفید فام لوگ سوچتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک خود ساختہ بھارتیہ ماڈل ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے تمام فرقے اور گروہ اسی ماڈل میں اپنے آپ کو ڈھال لیں۔ اس نقطۂ نظر کو کچھ لوگ بھارتیہ کرن کا نام دیتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو انڈیانائزیشن کہتے ہیں۔

مگر یہ ہندستان میں بھی اسی طرح ناقابل عمل ہے جس طرح وہ امریکہ میں ناقابل عمل ہے۔ اس قسم کے ہر نظریہ کا مطلب تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ہے۔ اور تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانا اور پھر خود اپنا سر توڑ لینا۔

مضمون نگار نے بجا طور پر امریکی مسئلہ کا حل کلچرل پلورلزم کو بتایا ہے۔ یعنی ملک کے ہر تہذیبی گروہ کو اپنے تشخص پر قائم رہنے کا موقع دینا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا یہی ہندستان کے مسئلہ کا حل بھی ہے۔ ہندستان ایک بڑا ملک ہے۔ یہاں مختلف تہذیبی گروہ آباد ہیں۔ ان گروہوں کے تہذیبی تشخص کو مٹانے کی کوشش ملک میں فساد تو برپا کر سکتی ہے۔ مگر وہ خود تشخص کو ختم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ ہر ایک کے انفرادی تشخص کو تسلیم کیا جائے۔ ہندستان کو ایک باغ کی حیثیت دی جائے جہاں طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائی دے رہے ہوں نہ کہ صرف ایک پھول اور صرف ایک پودا۔ ہندستانی سماج کی کامیاب تشکیل صرف تنوع کے اصول پر ہو سکتی ہے، وہ یکسانیت کے اصول پر کبھی نہیں ہو سکتی۔

انفرادی تصویر، مجموعی تصویر

ایک مسلمان تاجر نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارا بزنس زیادہ تر ہندو صاحبان سے ہوتا ہے۔ وہ ڈیلنگ میں بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ کسی ایک مسلمان کی بات نہیں۔ آپ جس مسلمان سے پوچھیں۔ وہ خواہ وکیل ہو یا ڈاکٹر، دکان دار ہو یا کوئی ادارہ چلاتا ہو، ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کے اعتبار سے ہندو کو ہمیشہ اچھا بتائے گا۔

مگر انھیں مسلمانوں سے ہندستان میں مسلم ملت کے مسائل پر بات کیجئے تو ہر مسلمان فوراً ہندو کی شکایت کرنے لگے گا۔ وہ کسی ایک یا دوسرے الفاظ میں کہے گا کہ ــــــ ہندو متعصب ہے۔ ہندو فساد کرتا ہے۔ ہندو مسجد گراتا ہے۔ ہندو یہاں کے مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔

ایک ہی مسلمان کی رائے میں یہ فرق کیوں۔ کیا وجہ ہے کہ ہر مسلمان ایک اعتبار سے ہندو کی تعریف کرتا ہے، اور وہی مسلمان دوسرے اعتبار سے ہندو کو برا بتاتا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ کوئی مسلمان جب ذاتی تجربہ کے اعتبار سے ہندو کے بارہ میں رائے دیتا ہے تو اس کے ذہن میں ہندو کی انفرادی تصویر (individual picture) ہوتی ہے۔ اور جب وہ ملی نقطۂ نظر سے ہندو کے بارہ میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں ہندو کی اجتماعی تصویر (collective picture) آجاتی ہے۔ انفرادی تصویر میں صرف ایک ہندو کا سلوک اس کے سامنے ہوتا ہے، اجتماعی تصویر میں تمام ہندوؤں کا عمومی سلوک اس کے سامنے آجاتا ہے۔

انفرادی تصویر میں ہندو اس کو ایک اچھا انسان دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ہر انسانی گروہ کی طرح، ہندوؤں کی بھی ۹۵ فی صد تعداد اچھی ہی ہے۔ مگر اجتماعی تصویر میں بیک وقت پورا ہندو فرقہ مجموعی شکل میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اس مجموعی تصویر میں اس کو کہیں دکھائی دیتا ہے کہ ایک شہر سے فساد کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ کہیں ایک مسجد گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ہندو کسی مسلمان کے ساتھ تعصب کا معاملہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہی معاملہ برعکس صورت میں ہندو کا بھی ہے۔ کسی ہندو سے آپ بات کریں تو وہ انفرادی تعلق کے اعتبار سے مسلمان کی تعریف کرے گا۔ ہندو تاجر، ہندو ڈاکٹر، ہندو وکیل، ہندو کارخانہ دار اپنے

تجربہ میں آنے والے مسلمان کے بارہ میں ہمیشہ اچھے کلمات کہیں گے۔

مگر جب ہندو سے فرقہ وارانہ مسائل پر گفتگو ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ہندو فوراً مسلمان کا شاکی ہو گیا ہے۔ اب مسلمان اس کو ایسے گروہ کی صورت میں دکھائی دینے لگے گا جو ملک کے لیے صرف بوجھ ہو، اس سے ملک کو کوئی فائدہ ملنے والا نہ ہو۔

اس فرق کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مسلمانوں میں بھی، دوسرے انسانی گروہوں کی طرح، زیادہ تر اچھے لوگ ہی ہیں۔ اس لیے مسلمان، انفرادی تجربہ میں، ہندو کو اچھا ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر کوئی ہندو جب مسلمانوں کی اجتماعی تصویر کو سامنے رکھ کر غور کرتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ مسلمان کہیں ہندووں کا جلوس روک رہے ہیں۔ کہیں کوئی مذہبی اشو لے کر ہندووں سے لڑ رہے ہیں۔ کہیں ہندووں کے راستہ میں رکاوٹ ڈالے ہوئے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں اگرچہ تھوڑے ہی مسلمان ملوث ہوتے ہیں مگر مجموعی تصویر میں ایسے واقعات پورے مسلم فرقہ سے منسوب ہو جاتے ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کی تصویر بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان جب ہندو کو برا کہتا ہے تو وہ جنرلائزیشن (generalization) کا شکار ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی ہندو جب مسلمان کو برا سمجھتا ہے تو وہ بھی جنرلائزیشن کی بنا پر ایسا سمجھتا ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں اگر معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھ جائیں تو وہ ایسا نہیں کریں گے کہ ایک کی بنا پر سب کو برا سمجھنے لگیں۔ اور جب وہ ایسا کریں گے تو دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔

تعمیر شعور

قومی یک جہتی کی اہمیت سب سے پہلے ہندستان کے سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے محسوس کی۔ انھوں نے اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کانفرنس بلائی۔ اس کا اجلاس نئی دہلی میں ۲۸ ستمبر تا یکم اکتوبر ۱۹۶۱ کو ہوا۔ اس کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق، اس خاص مقصد کے لئے ایک مستقل تنظیم نیشنل انٹگریشن کونسل (قومی یک جہتی کونسل) کے نام سے قائم کی گئی۔

اس کونسل کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ تمام متعلقہ مسائل کا جائزہ لے کر ضروری سفارشیں حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس کے مطابق، اس کا اجلاس ۲ - ۳ جون ۱۹۶۲ کو ہوا۔ اس اجلاس نے طے کیا کہ لسانی تعصب، علاقائی علیحدگی پسندی اور فرقہ واریت، یہ تین چیزیں قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے۔

۱۹۶۲ کے اس اجتماع کے بعد کئی سال تک نیشنل انٹگریشن کونسل کی کوئی مزید سرگرمی نہ ہو سکی۔ آخر کار مسز اندرا گاندھی نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۲۰ - ۲۱ جون ۱۹۶۸ کو سرینگر میں اس کا اجلاس بلایا گیا۔ سرینگر کی ٹھنڈی فضا میں نیشنل انٹگریشن کونسل کا یہ اجلاس ختم ہوا تو لوگوں نے اس سے کافی امیدیں وابستہ کیں۔ نار درن انڈیا پتریکا (۲۳ جون ۱۹۶۸) نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی کہ فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے دور رس اقدامات:

Far-reaching steps to end communalism.

سرینگر کے اجلاس میں نیشنل انٹگریشن کونسل نے کچھ سفارشات اتفاق رائے سے منظور کیں۔ ان سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً حکومت اس مقصد کے لئے سراغ رسانی کے خصوصی یونٹ قائم کرے۔ اس معاملہ میں جو سرکاری افسران اپنے فرائض سے کوتاہی کرتے ہوئے پائے جائیں ان کو سزا دی جائے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کی سماعت کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ میں ترمیم کرکے فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ سرکاری ملازمین کی بھرتی میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا

جائے۔ تیوہاروں کو مشترک طور پر منانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ وغیرہ

اس طرح قومی یک جہتی یا نیشنل انٹگریشن کی کوششوں پر اب ۴۰ سال گزر چکے ہیں۔ مگر اب تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس مدت میں قومی کشیدگی اور قومی اختلافات اس سے بھی زیادہ ہو گئے جو ۴۰ سال پہلے ہمارے ملک میں پائے جاتے تھے۔

میں نے اس موضوع پر کافی غور کیا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے ملکوں کے حالات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ آخر کار میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی نہ ہونے کا جو اصل سبب ہے اس کو دور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ملک کے اندر قومی جہتی کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور وہ سبب ہے شعور کی کمی۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے عام طور پر جو تجویزیں پیش کی جاتی ہیں وہ تقریباً سب کی سب سسٹم یا نظام سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اس طرح کی سماجی خرابیاں سسٹم کے بدلنے سے درست نہیں ہوتیں۔ ان خرابیوں کا تعلق تمام تر افراد سے ہے۔ یہ دراصل افراد ہیں جو سسٹم کو چلاتے ہیں۔ اس لئے سسٹم کو درست کرنے کے لئے افراد کو درست کرنا ہوگا۔

کسی سماج کا درست ہونا تمام تر اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد کا مزاج درست ہو۔ مثال کے طور پر جاپان کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ ان کے اوپر کوئی سردار مقرر کیا جائے تو وہ فوراً اس کی ماتحتی کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس لئے جاپان کے سماج میں اتحاد ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی کی ماتحتی کو قبول نہیں کرتے، اس لئے ہمارے ملک کے سماج میں اتحاد نہیں۔

میں نے اس سلسلہ میں جاپان کی تاریخ کا کافی مطالعہ کیا۔ میں نے پایا کہ جاپان میں یہ مزاج تعلیم کے ذریعہ آیا۔ جاپان میں ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔ مزید یہ کہ اسکول کی سطح پر ان کے یہاں تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ اس طرح جاپان کا ہر شخص نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ وہ شعوری حیثیت سے بیدار ہے اور اپنے اندر تعمیری ذہن رکھتا ہے۔

اس مطالعہ کے بعد، نیز دوسرے تاریخی پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد میری قطعی رائے ہے کہ ہندستان کے سماجی جھگڑوں کا واحد حل یہ ہے کہ قوم کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ قوم

کے ہر فرد کے اندر تعمیری شعور پیدا کیا جائے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن ملک کے اندر وہ چیز بھی پیدا ہو جائے گی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

اس نظریہ کی صحت کی ایک مثال خود ہمارے ملک میں موجود ہے۔ ہندستان میں عمومی سطح پر لٹریسی، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے بیان کے مطابق ۳۶ فیصد ہے۔ مگر جنوبی ہندستان کی ایک ریاست کیرلا میں لٹریسی تقریباً صد فی صد تک پہنچ چکی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ بقیہ ہندستان میں طرح طرح کے جھگڑے جاری رہتے ہیں۔ مگر کیرلا کی ریاست سماجی جھگڑوں سے تقریباً پاک ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ تعلیم کی کمی سے شعوری ناپختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور تعلیم کا اضافہ لوگوں کے اندر شعوری بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور جہاں شعوری بالیدگی آجائے وہاں غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

تمام ترقی یافتہ ملکوں میں لازمی تعلیم کا اصول رائج ہے۔ ہر ترقی یافتہ سماج میں گورنمنٹ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہر شخص کو تعلیم یافتہ بنائے۔ چنانچہ ان قوموں اور سماجوں میں ہر آدمی تعلیم یافتہ ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس نے ترقی یافتہ سماج اور پس ماندہ سماج میں وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انڈیا میں ابھی لازمی تعلیم کے اصول کو رائج نہ کیا جا سکا۔ آزادی کے بعد دستور ہند میں اس سے کمتر درجہ میں ایک معیار طے کیا گیا تھا۔ مگر اس کو بھی ابھی تک زیر عمل نہ لایا جا سکا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس کو ان الفاظ میں ریکارڈ کیا ہے —— انڈیا اس دستوری ہدایت کو زیر عمل لانے میں ناکام رہا ہے کہ وہ چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لئے عمومی تعلیم کا انتظام کرے:

India has failed to carry out the constitutional directive of providing universal education for children in the age group of six to 14. (6/394)

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستانی سماج میں قومی یک جہتی پیدا نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے۔ ہمارا سماج تعلیم میں پچھڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہ شعور میں پچھڑا ہوا ہے۔ اور جو قوم شعور میں پیچھے ہو جائے وہ سماجی

تغیر میں بھی اسی نسبت سے پیچھے ہو جائے گی۔

تاہم اس کام کو صرف حکومت پر چھوڑنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ہندستانی کو اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔ ایک آدمی اگر صرف ایک آدمی کو پڑھا سکتا ہے تو وہ ایک آدمی کو پڑھائے۔ ایک آدمی ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے تو وہ ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ کچھ لوگ اسکول اور کالج کھولنے کی طاقت رکھتے ہوں تو وہ اسکول اور کالج کھول کر نوجوانوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ غرض ہر آدمی اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے اس مہم میں شریک ہو جائے۔

جب یہ تعلیمی مہم کامیاب ہوگی اور قوم صد فی صد تعلیم یافتہ ہو جائے گی تو اس وقت نہ صرف ملک میں قومی یک جہتی آچکی ہوگی بلکہ مزید تمام اوصاف کو حاصل کر کے ہمارا سماج ایک ترقی یافتہ سماج بن جائے گا جس کا ہم پچھلے پچاس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو

۳۰ برس کی کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں قومی ایکتا نہیں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ قومی ایکتا لانے کا جو طریقہ اپنایا گیا وہ درست نہ تھا۔

اس مدت میں ملک کے لیڈروں اور دانشوروں پر یہ خیال چھایا رہا ہے کہ" ایکتا " لانے کے لئے " انیکتا " کو ختم کرنا پڑے گا۔ اسی ذہن کے تحت اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ ملک میں سول میرج کا قانون نافذ کیا جائے۔ تمام لوگوں کو ایک کلچر میں ڈھال دیا جائے۔ جو لوگ زیادہ انتہا پسند ہیں وہ پرجوش طور پر کہتے ہیں کہ تمام لوگ رام کو اپنا پرکھ مانیں۔ تمام لوگ اپنے کو ہندو کہیں۔ وغیرہ۔ اس کو یہ حضرات ہندید (Indianisation) کہتے ہیں۔ مگر اس قسم کی یکسانیت عملاً ناممکن ہے۔ اس لئے وہ اب تک وقوع میں بھی نہ آسکی۔

کناڈا قومی ایکتا کے لئے ایک مثالی ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالاں کہ کناڈا میں اسی طرح مختلف مذہب اور تہذیب کے لوگ رہتے ہیں جس طرح ہندستان میں۔ کناڈا میں یہ قومی ایکتا جس طرح حاصل کی گئی ہے، اس کو وہ لوگ کثیر کلچریت (multiculturalism) کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مختلف فرقوں میں ایکتا لانے کے لئے یکساں کلچر (uniculturalism) کی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ وسیع تر قومی ڈھانچہ کے اندر ہر ایک کی جداگانہ اکائی کو مان لیا۔ اسی اصول پر چل کر کناڈا ترقی

کر رہا ہے۔ ہندستان کی ترقی بھی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ وہ اس آزمودہ طریقہ کو اپنے یہاں اختیار کرلے۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۱ کو شولا پور (مہاراشٹر) میں قومی ایکتا کے موضوع پر ایک اجتماع تھا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ شولا پور کی ایک معروف شخصیت اور سابق ایم ایل اے شری تلسی داس جادھو نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس نقطۂ نظر کی حمایت کی کہ اصل چیز موافقت اور روا داری کا مزاج ہے۔ اگر یہ مزاج ہو تو بڑے بڑے اختلاف کے باوجود باہمی میل ملاپ قائم ہوسکتا ہے۔

انھوں نے اپنے گھر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ میری ماں روزانہ صبح اٹھ کر نہاتیں اور میرے باپ کے لئے میٹ بنا کر اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہاتیں اور اپنے لئے دال سبزی والا کھانا بناتیں۔ اسی طرح وہ آخر عمر تک کرتی رہیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں دونوں کے درمیان اتنا بڑا اختلاف تھا۔ مگر دونوں زندگی بھر عزت اور محبت کے ساتھ مل کر رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی ایکتا ہو یا قومی ایکتا، ہر ایک کا تعلق ذہنی رویہ (mental attitude) سے ہے نہ کہ کلچر کی یکسانیت سے۔ انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ حتی کہ ایک گھر کے اندر چند آدمی ہیں تو ان میں بھی طرح طرح کا اختلاف ہوگا۔ اس کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف کو گوارا کرنا ہے۔ اختلاف کو مٹانے کی کوشش اختلاف کو بڑھاتی ہے۔ جبکہ اختلاف کو گوارا کرنے کی پالیسی اختلاف کو عملاً ختم کر دیتی ہے۔

مسٹر نکسٹ کا عظیم رول

دو بھائی ہوں تو ان میں سے ایک بڑا ہوگا اور ایک چھوٹا۔ دوسرے لفظوں میں، ایک مسٹر فرسٹ (Mr First) ہوگا اور دوسرا مسٹر نکسٹ (Mr Next) اسی طرح ہر انسانی مجموعہ میں ہمیشہ کوئی مسٹر فرسٹ ہوتا ہے اور کوئی مسٹر نکسٹ۔ یہ فطرت کا ایک ابدی قانون ہے۔ فطرت کے اس قانون کو ماننے ہی میں تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

تمام انسانی سماجوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسٹر نکسٹ اگر یہ حقیقت پسندی اختیار کرے کہ وہ فرسٹ پارٹی کے مقابلہ میں مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کرنے پر راضی ہو جائے تو خاندان یا ادارہ یا ملک ترقی کرتا ہے۔ اور اگر مسٹر نکسٹ اس اعترافِ واقعہ پر راضی نہ ہو تو اس کے بعد ترقی کا عمل بھی لازمی طور پر رک جائے گا۔ ظاہری تقسیم میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت اگرچہ "نکسٹ" ہوتی ہے مگر عملی اعتبار سے اس کا رول اتنا قطعی (crucial) ہے کہ ہر انسانی مجموعہ میں وہ کلیدی حیثیت کا حامل بن جاتا ہے۔ تاریخ سازی میں مسٹر نکسٹ کا رول نہایت عظیم ہے۔

تاریخ کے تمام بڑے واقعات اسی وقت ظہور میں آئے ہیں جب کہ دو شریک پارٹیوں میں سے ایک پارٹی نے اجتماعی عمل میں مسٹر نکسٹ بننا تسلیم کر لیا۔ اور جہاں ایسا نہیں ہوا وہاں یقینی طور پر کوئی بڑا واقعہ بھی ظہور میں نہ آسکا۔

تمام ترقیوں کا راز اس میں چھپا ہوا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بھرپور طور پر زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال ہوں۔ اور انسانی صلاحیتوں کے اس تعمیری استعمال کی صورت صرف یہ ہے کہ فطرت کی تقسیم میں جو مسٹر نکسٹ ہے وہ مسٹر نکسٹ کی حیثیت قبول کرنے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

اس قبولیت کی حالت میں سماج کے اندر مثبت سرگرمیاں جنم لیتی ہیں اور عدم قبولیت کی حالت میں منفی سرگرمیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایک صورت میں اعلیٰ انسانی قدروں کی روایتیں قائم ہوتی ہیں اور دوسری صورت میں پست انسانی قدروں کا رواج ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ ایک صورت میں سماج مشترک جدوجہد کا نمونہ بنتا ہے اور دوسری صورت میں پورا سماج باہمی ٹکراؤ کا جنگل بن جاتا ہے۔

چند مثالیں

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں دو بڑے گروہ تھے۔ ایک مہاجر، دوسرے انصار۔ اب سوال یہ تھا کہ خلیفہ (پیغمبر کا سیاسی جانشین) کون ہو۔ اس وقت انصار نے کہا کہ : منا امیر و منکم امیر (ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے) یہ گویا دونوں فریقوں کے درمیان سیاسی مساوات کا فارمولا تھا جو مدینہ کے انصار کی طرف سے پیش کیا گیا۔

مگر اصحاب رسول کی اکثریت نے سیاسی مساوات کے اس اصول کی مخالفت کی۔ کیوں کہ بظاہر خوش نما ہونے کے باوجود وہ قابل عمل نہیں تھا۔ مہاجر بزرگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کے بجائے دوسرا فارمولا ان لفظوں میں پیش کیا کہ : نحن الامراء وانتم الوزراء (ہم امیر ہوں اور تم وزیر) دوسرے لفظوں میں یہ کہ، انصار اپنے آپ کو مسٹر نکسٹ کے مقام پر رکھ کر مہاجرین کو مسٹر فرسٹ کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں۔

مہاجر گروہ کے بزرگ ترین فرد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس فارمولا کے حق میں مفصل تقریر کی اور اس کی تائید میں یہ حدیث رسول پیش کی کہ : الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں گے) آخر کار انصار کا گروہ نئے سیاسی نظام میں مسٹر نکسٹ بننے پر راضی ہو گیا۔ ان کی اس رضامندی نے اسلام کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔ اگر خدانخواستہ مدینہ کے انصار مسٹر نکسٹ بننے پر راضی نہ ہوتے تو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ہی دونوں مسلم گروہوں کے درمیان عہدوں کی لڑائی چھڑ جاتی۔ اور پھر شاید اسلام کی تاریخ ہمیشہ کے لیے مدینہ میں دفن ہو جاتی۔

اب انڈیا کی مثال لیجئے۔ ۱۹۴۷ میں جب انڈیا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا تو اس وقت انڈین نیشنل کانگریس میں دو سب سے زیادہ ابھرے ہوئے لیڈر تھے جن میں سے کسی ایک کو نئے ہندستان کا وزیر اعظم بننا تھا۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ کانگریس پارٹی میں دونوں کے حامی موجود تھے۔

اس وقت مہاتما گاندھی نے دانش مندی سے کام لیا اور پنڈت نہرو کے حق میں اپنی رائے دے دی۔ سردار پٹیل کے لیے بلاشبہ یہ ایک سخت فیصلہ تھا۔ تاہم انھوں نے اپنی حیثیت کا

اعتراف کرتے ہوئے ہندستان کے نئے سیاسی نظام میں اپنے لیے مسٹر نکسٹ کا رول منظور کر لیا۔

سردار پٹیل کی اسی حقیقت پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں سیاسی عہدوں کی جنگ برپا نہیں ہوئی اور کسی رکاوٹ کے بغیر ملکی ترقی کا سفر شروع ہو گیا۔ سردار پٹیل اگر مسٹر نکسٹ بننے پر راضی نہ ہوتے تو کبھی ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

پاکستان میں بدقسمتی سے برعکس صورت پیش آئی۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان وجود میں آیا تو اس کے دو بڑے جغرافی حصے بنے۔ ایک موجودہ بنگلہ دیش اور دوسرا سابق مغربی پاکستان۔ تاریخی اور سیاسی اسباب نے مغربی پاکستان کے لیے مسٹر فرسٹ کا رول لکھ دیا تھا اور بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) کے لیے مقدر تھا کہ وہ نومولود ریاست میں مسٹر نکسٹ کا رول ادا کرے۔ لیکن بنگلہ دیش کو یہ پسند نہیں آیا کہ وہ مسٹر نکسٹ کی سیٹ پر بیٹھے۔ اس کا یہ اندوہناک نتیجہ نکلا کہ وجود میں آنے کے صرف ۲۴ سال بعد پاکستان کا "خداداد ملک" دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک طاقت ور ملک دو کمزور خطوں میں بٹ کر رہ گیا۔

تاہم پاکستان میں اعتراف واقعہ کی بھی ایک جزئی مثال موجود ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں تقریباً دو ملین ہندو باقی رہ گئے تھے۔ یہ ہندو وہاں کی مسلم اکثریت کے مقابلہ میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پاکستان کے ہندو نے ایک دن کی تاخیر کے بغیر اپنی وہ حیثیت تسلیم کر لی جو تاریخی حالات نے اس کے لیے مقدر کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے حق میں شاندار نکلا۔ آج پاکستان میں یہ مسٹر نکسٹ وہاں کے مسٹر فرسٹ سے زیادہ محفوظ، زیادہ خوش حال اور زیادہ ترقی یافتہ زندگی کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات خود پاکستان کے ایک سروے کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے۔

ہندو مسلم مسئلہ

انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا معاملہ بھی اسی قانونِ فطرت کے تحت آتا ہے۔ اس قانونِ خداوندی کو ہمیں دل کی آمادگی کے ساتھ مان لینا ہے۔ اگر ہم اس کو نہ مانیں تو فطرت کا قانون تو نہ بدلے گا۔ البتہ ہم ابدی طور پر ایک تباہ شدہ گروہ بن کر رہ جائیں گے۔

انڈیا کے تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات نے اس ملک میں ہندو کو مسٹر فرسٹ کی حیثیت دے دی ہے۔ اور مسلم فرقہ کے لیے یہ مقدر کر دیا ہے کہ کم از کم فی الحال وہ اس عظیم ہندستانی

سماج کے اندر مسٹر ٹکسٹ کا رول ادا کرے۔ یہ فطرت کا فیصلہ ہے۔ اور فطرت کا فیصلہ خود خدا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو یہاں مسٹر ٹکسٹ کی پوزیشن کو اسی طرح تسلیم کرنا ہے جس طرح وہ دوسرے قوانین الٰہی کو اٹل سمجھ کر اسے تسلیم کرتے ہیں۔

حقیقت اپنی ذات میں حقیقت ہوتی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو حقیقت کو عزت کے ساتھ مان لے۔ کیوں کہ حقیقت کو اگر عزت کے ساتھ نہ مانا جائے تو آخر کار اسے ذلت کے ساتھ ماننا پڑے گا۔

ہندستان کی آزادی پر نصف صدی پوری ہو رہی ہے۔ مگر اب تک ہندستان وہ ترقی نہ کر سکا جو اپنے امکانات کے اعتبار سے اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس المیہ کا واحد بڑا سبب اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کی نزاع ہے۔ دونوں کے درمیان یہ مسلسل نزاع اسی لیے قائم ہے کہ جو فرقہ مسٹر ٹکسٹ ہے وہ مسٹر ٹکسٹ بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں۔

انڈیا میں اور بھی کئی اقلیتیں ہیں۔ مگر مسلم گروہ یہاں مسٹر ٹکسٹ ہے، کیوں کہ وہی نکسٹ ٹو مجاریٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فرق کسی سازش کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اسی خالق کے منصوبہ کے تحت ہے جو کسی کو پہلے بھائی کی حیثیت سے پیدا کرتا ہے اور کسی کو دوسرے بھائی کی حیثیت سے۔

مسلمان ابھی تک فطرت کے اس فیصلہ کو قبول نہ کر سکے۔ پچھلے پچاس سال سے مسلمان یہاں کے ہندو کو رقیب کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور ان سے حریفانہ تعلق قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس تلخ صورت حال کا سبب ان کا یہی عدم اعتراف ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان خود بھی تباہ ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ملک کی تباہی کا سبب بھی بن رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کے لیے صرف ایک ہی انتخاب (choice) ہے۔ دوسرا کوئی انتخاب سرے سے یہاں ممکن ہی نہیں۔ وہ واحد انتخاب یہ ہے کہ مسلمان حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے مسٹر ٹکسٹ کی پوزیشن قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ یہی مسلمانوں کے اپنے مسئلہ کا حل بھی ہے اور یہی پورے ملک کے مسئلہ کا حل بھی۔

سیاست ممکن کا فن ہے (Politics is the art of pos-ible) یہ عملی سیاست

لیے مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کرنا درحقیقت ناممکن کے مقابلہ میں ممکن کو اختیار کرنا ہے۔ مسٹر نکسٹ اس معاملہ میں اگر فطرت کے فیصلہ کو قبول نہ کرے تو وہ خود اپنے آپ کو ہر قسم کے نقصان میں مبتلا کرلے گا۔ مسٹر نکسٹ کے لیے مسٹر نکسٹ کا رول قبول کرنا خود اپنی ترقی اور کامیابی کا دروازہ کھولنا ہے۔ جو مسٹر نکسٹ ایسا نہ کرے، عملی طور پر وہ سماج کے اندر مسٹر ایجی ٹیٹر بن کر رہ جائے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ وہ حاصل نہیں کرسکتا۔

حقائق کا فیصلہ

کوئی مسلم دانشور یہاں کہہ سکتا ہے کہ انڈیا میں تو ڈیموکریسی ہے۔ پھر ہم کیوں اپنے لیے مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کریں۔ میں کہوں گا کہ ڈیموکریسی کسی یوٹوپیا کا نام نہیں۔ ڈیموکریسی میں بھی کسی کو مسٹر نکسٹ بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی عملی طور پر ڈیموکریسی کا نظام کسی ملک میں قائم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اس وقت ڈیموکریسی ہے۔ مگر ۱۹۹۳ کے الکشن کے بعد نواز شریف کو مسٹر نکسٹ بننا پڑا۔ اس کے بعد ہی بے نظیر بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے تحت پاکستان میں ڈیموکریسی کا نظام قائم ہوا۔

دوسری بات یہ کہ زندگی کے معاملات الفاظ کے تابع نہیں ہیں۔ زندگی کے معاملات حقائق کے تابع ہیں۔ خالص اصولی اعتبار سے آئیڈیلزم بہت اچھی چیز ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ زندگی کا عملی نظام ہمیشہ پریگمیٹزم (pragmatism) کی بنیاد پر چلتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اٹل اصول ہے جس میں کسی بھی نظام کا کوئی استثنا نہیں۔

اس کی ایک متعلق مثال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مارچ ۶۳۲ء میں مدینہ سے مکہ گئے اور وہاں حج کا فریضہ ادا کیا۔ اسلام کی تاریخ میں اس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے مشہور خطبہ میں (نیز اس سے پہلے بھی) اعلان فرمایا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عربی اور عجمی، اسود اور احمر سب برابر ہیں۔ کوئی حبشی تمہارے اوپر حکمراں بنا دیا جائے تب بھی تم اس کی اطاعت کرو۔

اس اعلان کے تقریباً ڈھائی مہینہ بعد ۸ جون ۶۳۲ء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو بزرگ صحابی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ خلیفہ صرف قبیلۂ قریش میں سے بنایا جائے گا۔

کیوں کہ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور کی سرداری قبول نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوسرے قبیلہ کا آدمی خلیفہ بنایا گیا تو عرب کے لوگ بغاوت کر دیں گے۔ گویا اسلام کے عین دور اول میں خلیفہ کا انتخاب پریگمیٹزم کی بنیاد پر کیا گیا نہ کہ آئیڈیلزم کی بنیاد پر۔

آخری بات

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا یہ اعتراف خود خدا کا اعتراف ہے۔ یہ "مسٹر نکسٹ" بننا انسان کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ خدا کے مقابلہ میں ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے۔ اسی اطاعت میں خالق کائنات نے تمام انسانی ترقیوں کا راز رکھ دیا ہے۔ اسی میں ہماری دنیا کی ترقی بھی چھپی ہوئی ہے اور اسی میں ہماری آخرت کی ترقی بھی۔

واضح ہو کہ فرسٹ اور نکسٹ کے اس معاملہ کا تعلق صرف خارجی ڈھانچہ سے ہے نہ کہ کسی شخص یا گروہ کی واقعی حیثیت سے۔ یہ صرف ایک انتظامی بندوبست کا معاملہ ہے۔ دونوں کے درمیان یہ تقسیم برائے ضرورت ہوتی ہے نہ کہ برائے فضیلت۔ اگر آدمی کی اپنی ذہنی سطح بلند ہو، اگر اس کے پاس فریق ثانی کے مقابلہ میں زیادہ برتر آئیڈیالوجی ہو تو خارجی ڈھانچہ میں بظاہر مسٹر نکسٹ بننے کے باوجود وہ اپنی ذہنی سطح پر اپنے کو مقابلۃً برتر محسوس کرے گا۔ محدود عملی سطح پر مسٹر نکسٹ بننے کے باوجود مستقل فکری سطح پر وہ برتر احساسات کے ساتھ جئے گا۔

فکری طاقت ہی زندگی میں ہمیشہ فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ مسٹر نکسٹ کو اگر نظریاتی برتری حاصل ہو تو باہمی تعامل کے دوران خود مسٹر فرسٹ اس کی برتری کو ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ حتی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وقتی نظام میں جو فریق مسٹر نکسٹ ہو وہ مستقبل میں مسٹر فرسٹ سے بھی زیادہ اونچا مقام پائے۔ اور جو فریق آج فرسٹ کے درجہ میں دکھائی دے رہا تھا وہ کل کی تاریخ میں سرے سے غیر مذکور ہو کر رہ جائے۔ یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں کہا — لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول :

But many that are first shall be last. And the last first. (St. Mark 10:31)

مستقبل کی طرف

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا دن ہندستان کے لیے ایک زلزلہ خیز دن تھا جب کہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھانے کا واقعہ پیش آیا۔ بظاہر ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارا قومی سفر ایک ناقابلِ عبور دلدل میں پھنس کر رہ گیا ہے۔

اس وقت میں نے مسئلہ کے حل کے لیے ایک قابل قبول فارمولا پیش کیا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ یہ دراصل عبادت گاہوں کے موجودہ ایکٹ (Places of Worship Act 1991) ہی کا نئے الفاظ میں (formulation) تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، پارلیمنٹ کے اس پاس شدہ قانون میں طے کیا گیا تھا کہ ملک کی تمام عبادت گاہوں کو ان کی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی حالت (statusquo) پر برقرار رکھا جائے گا، باستثنا بابری مسجد (excluding Babri Masjid) اب میں نے صرف یہ کیا کہ اس قانون کی اسپرٹ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو ایک متعین فارمولا کی صورت دے دی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو مذکورہ قانونی استثنا (exclusion) وقوع میں آگیا۔ چنانچہ فارمولے میں یہ کہا گیا تھا کہ دیش کے عظیم تر انٹرسٹ کی خاطر دونوں فرقے مذکورہ ایکٹ کو لیٹر اینڈ اسپرٹ کے ساتھ مان لیں۔ دونوں فرقے اس پر راضی ہو جائیں کہ مسلمان بابری مسجد کے سوال پر چپ ہو جائیں گے۔ اور ہندو اس کے بعد بقیہ مسجدوں کے بارہ میں اپنی مانگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

ابتداءً میں دونوں فریق یہ محسوس کر رہے تھے کہ اس فارمولا کو عمل کی صورت دینے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ مگر پچھلے ایک سال کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ یہ اندیشے درست نہ تھے۔ واقعات کی رفتار پوری طرح اس تجویز کی موافقت میں ہے۔ اب ہم زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ اس نزاع کو آخری طور پر فراموشی کے خانہ میں ڈال دیں۔

مذکورہ فارمولا جب سامنے آیا تو مسلمانوں کی طرف سے عام طور پر یہ کہا گیا کہ نزاع کے خاتمہ کے لیے ہم اس پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم بابری مسجد کو بھلا دیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دوسرا فریق تو اس کے بعد بھی بہت سی مسجدوں کی فہرست اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے اردو پریس میں خاص طور پر اس واقعہ کو بہت زیادہ دہرایا گیا کہ ۶ دسمبر کو جو ہجوم بابری مسجد کو ڈھار ہا تھا وہ بآوازِ بلند

یہ اعلان کر رہا تھا : اجودھیا تو جھانکی ہے ، متھرا کاشی باقی ہے ۔

راقم الحروف نے اس معاملہ میں وسیع پیمانہ پر مسلم طبقات کا جائزہ لیا۔ اس کے نتیجہ میں میں جس رائے پر پہنچا وہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کا (main concern) بابری مسجد نہیں ہے ۔ اب ان کی توجہ کا مرکز وہ بقیہ مسجدیں ہیں جن کے بارہ میں دعویٰ کیا جاتا رہا ہے اور جن کے تحفظ کے بارہ میں مسلمانوں کو پورا اطمینان ابھی تک حاصل نہیں ۔

لیکن نومبر ۱۹۹۳ میں ہونے والے ریاستی الکشن نے خوش قسمتی سے مسلمانوں کے اس اندیشہ کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ جیسا کہ نتائج سے معلوم ہوتا ہے ، اس الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی ، دوسری ریاستوں کے ساتھ ، خود یوپی میں بھی طاقت ور اکثریت حاصل نہ کرسکی ۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ اس معاملہ میں اب ہندو موڈ کیا ہے ۔

اتر پردیش کے ٹاؤن اجودھیا میں جب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائی گئی ، اس وقت اتر پردیش میں بی جے پی کی حکومت قائم تھی ۔ کم از کم مسلم نقطۂ نظر کے مطابق ، بابری مسجد کا انہدام اسی سیاسی فیکٹر کی بنا پر ممکن ہوا ۔ اب اگر ہندو کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی چیز یہ ہوتی کہ اس اسٹیٹ میں واقع متھرا اور کاشی کی مسجدوں کا بھی وہی انجام ہو جو اجودھیا کی مسجد کا ہوا ہے تو ریاستی الکشن ہندو کو سنہرا موقع دے رہا تھا کہ وہ بڑے پیمانہ پر اپنی سپورٹ دے کر دوبارہ یوپی میں بی جے پی کی طاقتور حکومت بنائے تاکہ اس کی چاہت کے مطابق بقیہ مسجدوں کا انہدام آسان ہو جائے ۔ مگر الکشن کا رزلٹ بتاتا ہے کہ ریاست کے ہندو ووٹروں نے اس تقاضے کو اہمیت نہ دی ۔ چنانچہ یوپی اسمبلی میں بی جے پی کوئی طاقتور حیثیت حاصل نہ کرسکی ۔ ۴۲۵ سیٹوں کے ایوان میں اس کو صرف ۱۷۷ سیٹ ملی ۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ الکشن میں ہندو کمیونٹی نے غیر ملفوظ زبان میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اطمینان رکھو ، اب ہم کسی اور مسجد کا باب کھولنے والے نہیں ہیں ۔ اگر ہم کو ایسا کرنا ہوتا تو ہم ضرور بی جے پی کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرتے ۔ اس معاملہ میں بابری مسجد ہی اول تھی اور وہی آخر بھی ۔ "متھرا کاشی باقی ہے" کا نعرہ ہم میں سے چند ناسمجھ لوگوں کا نعرہ تھا ۔ وہ عمومی طور پر ہندو کمیونٹی کا نعرہ ہرگز نہیں ۔

موجودہ الکشن سے یہ نتیجہ دو اور دو چار کی طرح نکل رہا ہے ۔ اس واضح اظہار کے بعد اب کوئی

وجہ نہیں کہ مسلمان بقیہ مسجدوں کے معاملہ میں ہندو کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ خود ساختہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلسل یہ مانگ کر رہا تھا کہ بابری مسجد کو دوبارہ وہیں بناؤ۔ یہ لوگ یہ تاثر دے رہے تھے کہ وہ سارے مسلمانان ہند کے نمائندہ ہیں اور تمام مسلمانوں کی طرف سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ مگر واقعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس معاملہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہرگز مسلمانان ہند کی خواہش کا ترجمان نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کوشش کے باوجود یہ تنظیم اس عنوان پر ہندستانی مسلمانوں کو دوبارہ متحرک (mobilize) نہ کر سکی جس طرح ۶ دسمبر سے پہلے کچھ تنظیمیں مسلمانوں کو اس عنوان پر متحرک کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ بابری مسجد کے نام پر ریلی اور مارچ کی سیاست کو مسلمان اسی طرح چھوڑ چکا ہے جس طرح ہندو مسجد ہٹاؤ مندر لاؤ کی سیاست کو۔

یہ بات پریس میں آچکی ہے کہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی۔ اس میٹنگ میں انھوں نے ملک کے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ ۳ دسمبر ۱۹۹۳ کو وہ ملک بھر کی مسجدوں میں بابری مسجد کی تعمیر نو کے لیے یوم دعا منائیں۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بابری مسجد کے ڈھائے جانے کا واقعہ ۶ دسمبر کو ہوا تھا۔ اسی لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران ۶ دسمبر کو دہلی میں جمع ہوئے تاکہ وزیر اعظم ہند کی رہائش گاہ پر پہنچ کر انھیں میمورنڈم دیں۔ ایسی حالت میں یوم دعا کے لیے ۶ دسمبر کو چھوڑ کر ۳ دسمبر کی تاریخ آخر کیوں چنی گئی۔

اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ۳ دسمبر کو جمعہ (مسلمانوں کی ہفتہ وار اجتماعی عبادت) کا دن تھا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مسلمانوں کو اب بابری مسجد کی تعمیر نو سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اور خاص اس کے لیے وہ ۶ دسمبر کو ہرگز ملک کی مسجدوں میں جمع ہونے والے نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے فرضی مظاہرہ کے مقصد سے ۳ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ کیوں کہ اس تاریخ کو جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے آپ ہی مسجدوں میں اکٹھا ہوں گے۔ اور اس کو استعمال کر کے بورڈ کے ممبروں کو غلط طور پر یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دیکھو، تمام ملک کے مسلمان اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اسی لیے تو ہماری کال پر انھوں نے ملک بھر کی

مسجدوں میں جمع ہو کر بابری مسجد کے لیے یوم دعا منایا۔

خلاصہ یہ کہ عبادت گاہوں کے ایکٹ کی مطابقت میں بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے لیے جو فارمولا پیش کیا گیا تھا اب ہندو اور مسلمان دونوں عملاً اسی پر قائم ہو چکے ہیں۔ اس طرح گویا دونوں فریقوں کے درمیان ایک قسم کا بلا اعلان اگریمنٹ واقع ہو چکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ شعوری طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر کے اس نزاع کا بالاعلان خاتمہ کر دیا جائے تاکہ دیش کا ترقی کی طرف سفر کسی رکاوٹ کے بغیر دوبارہ شروع ہو جائے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۵۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

مردان کار کی ضرورت

انڈیا برٹش اقتدار سے ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ مگر برٹش اقتدار کے خلاف انڈیا کی جنگ آزادی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ۱۷۹۹ میں سلطان ٹیپو برٹش فوجوں سے لڑتے ہوئے قربان ہو گئے۔ ۱۸۵۷ - ۵۸ میں برٹش اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی لیکن انگریزوں نے اس کو ناکام بنا دیا۔ اس طرح کی مسلح لڑائیاں انگریزوں کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہیں۔ مگر ہندستانیوں کی یک طرفہ تباہی کے سوا ان کا کوئی اور نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ میں ساوتھ افریقہ سے انڈیا واپس آئے۔ اور انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے جو ۲۵ سال پہلے کچھ آزادی پسند لوگوں نے قائم کی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ہندستان کی تحریک آزادی میں ایک نئے اصول ستیہ گرہ کا اضافہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی سیاست میں ایک زلزلہ آگیا :

He announced a Satyagraha struggle. The result was a virtual political earthquake that shook the subcontinent in the spring of 1919. (7/876)

مہاتما گاندھی سے پہلے انڈیا کی تحریکِ آزادی تشدد (violence) کے اصول پر چل رہی تھی۔ آزادی کی مانگ کرنے والے انگریزوں کے اوپر تشدد کرتے تھے۔ اس کے جواب میں انگریز اور زیادہ تشدد کرکے ان کو کچل دیتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ ہم اپنی آزادی کی تحریک کو عدم تشدد (non-violence) کی بنیاد پر چلائیں گے۔ انھوں نے بم اور گولی کو پھینک دیا اور اس کے بجائے ہندستانی عوام کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔

اس نئی تحریک نے انگریزی حکومت کو بے بس کر دیا۔ اس سے پہلے وہ تشدد کو توڑنے کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ مگر مہاتما گاندھی کی اہنسا نے انگریزوں سے تشدد کا جواز چھین لیا۔ چنانچہ اسی زمانہ کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو ٹیلی گرام بھیجا کہ براہ کرم یہ بتائیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently?

مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کے طریقہ کو اختیار کر کے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو سیاسی آزادی حاصل کر لی۔ مگر آج ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کا اصل مشن پورا نہیں ہوا۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پونچھنا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ رونے والوں کے آنسو پونچھے نہ جا سکے۔ بلکہ آزادی کے بعد رونے والی آنکھوں میں کچھ اور آنکھوں کا اضافہ ہو گیا۔

آزادی کے بعد مہاتما گاندھی ایک اور اندولن چلانے والے تھے۔ یہ نئے ہندستان کی تعمیر کا اندولن تھا۔ مگر وہ اپنے مشن کے دوسرے مرحلہ کو پورا نہ کر سکے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو دہلی میں ایک انتہا پسند نوجوان کی گولی نے قبل از وقت ان کا خاتمہ کر دیا۔

اب ہمیں ایک اور گاندھی کی ضرورت ہے۔ پہلے گاندھی نے ۱۹۴۷ سے قبل تحریکِ آزادی کو تشدد کے راستہ سے ہٹا کر عدم تشدد کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ دوسرے گاندھی کو اسی قسم کی تبدیلی کا ایک زیادہ مشکل کام انجام دینا ہے۔ یہ کام ہے ——— اہل ملک کے لیے ذاتی انٹرسٹ کے بجائے نیشنل انٹرسٹ کو سپریم بنا دینا۔

آزادی کے بعد نئے ہندستان کے بارہ میں ہمارا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے قومی آزادی لوگوں کا مقصد تھا۔ آزادی کے بعد قومی انٹرسٹ کو لوگوں کا مقصد بن جانا چاہیے تھا۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ اس کے بجائے ذاتی انٹرسٹ لوگوں کا نشانہ بن گیا۔ تعمیر خویش کی بڑھی ہوئی حرص میں تعمیر وطن کا کام انجام پانے سے رہ گیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔ اور اسی کے بعد انڈیا نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کی۔ آج جاپان اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ اس کو اقتصادی سپر پاور کہا جاتا ہے۔ جب کہ انڈیا عالمی اقتصادی نقشہ میں سب سے نیچے جگہ پائے ہوئے ہے۔ اس فرق کا سبب دونوں کے مزاج کا فرق ہے۔ جاپانیوں کے نزدیک جاپان کا نیشنل انٹرسٹ سپریم حیثیت رکھتا ہے اور ان کا ذاتی انٹرسٹ اس کے مقابلہ میں صرف سکنڈری ہے۔ انڈیا میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ یہاں کے انسان کے لیے اس کا ذاتی انٹرسٹ اول بن گیا ہے اور نیشنل انٹرسٹ کی حیثیت صرف ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ملک کے سامنے سیاسی ڈھانچہ کی تبدیلی کا نشانہ تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد ذہنی

ڈھانچہ کی تبدیلی کا نشانہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلے مسئلہ کے مقابلہ میں دوسرا مسئلہ یقیناً زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اگر جاپان اور دوسری ترقی یافتہ قوموں نے اس دوسری تبدیلی کے میدان میں کامیابی حاصل کرلی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تبدیلی کو اپنے ملک میں لانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

آج انڈیا کو ایک نئے گاندھیائی اندولن کی ضرورت ہے جو انڈیا میں اس دوسری تبدیلی کو واقعہ بنا سکے۔ جو لوگوں کی سوچ کو بدلے۔ جو ذاتی انٹرسٹ پر چلنے والوں کو قوم کے انٹرسٹ پر چلنے والا بنا دے۔ یہ ملک کے مستقبل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی نے بالکل درست کہا ہے کہ کسی تہذیب نے اخلاقی اور روحانی احیاء کے بغیر کبھی ترقی نہیں کی:

No civilization has flourished without a moral and spiritual renaissance.

نئے انڈیا کی تعمیر بھی دوبارہ طریق عمل کی ایک تبدیلی کا تقاضا کر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں انڈیا کی قسمت آئی، انھوں نے نئے انڈیا کی تعمیر کے لیے جس نسخہ کا تجربہ کیا وہ ڈھانچہ (system) کی تبدیلی تھی۔ اب ہمیں اس کے بجائے فرد (individual) میں تبدیلی کو اپنا نشانہ بنانا ہے۔

پچھلے ۴۵ سال میں سماجی زندگی کے تمام شعبوں کو بار بار بدلا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنے قوانین بنائے گئے ہیں کہ اب بنانے والوں کو بھی اس کی گنتی کا علم نہیں۔ مگر عملی حالات میں کوئی بھی بہتری نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ڈھانچہ کو آخر کار جو کنٹرول کرتا ہے وہ ایک انسان ہے۔ اور انسان کو بدلنے کا کام سرے سے ہمارے یہاں نہیں ہوا۔

انسان کو بدلنے سے مراد انسان کی سوچ کو بدلنا ہے۔ انسان کو صحیح رخ پر سوچنے والا بنانا ہے۔ مثلاً بابری مسجد کے معاملہ میں ہندو اور مسلمان دونوں غلط فکری کا شکار ہوئے۔ مسلم لیڈروں نے اس اشو کو مقامی دائرے سے نکال کر آل انڈیا اشو بنایا۔ اس طرح انھوں نے ایک سادہ اور چھوٹے اشو کو بڑھا کر پوری اکثریتی کمیونٹی کے لیے پرسٹیج اشو بنا کر اس کی پیچیدگی میں اضافہ کر دیا۔

دوسری طرف انتہا پسند ہندوؤں نے سمجھا کہ وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ تاریخ کی تصحیح کرسکیں۔ انھوں نے تاریخ کی تصحیح کے نام پر بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ مگر ڈھانے کے بعد انھیں معلوم

ہوا کہ وہ ماضی کی درستگی کے نام پر صرف حال کی بربادی کا کام انجام دے رہے تھے۔

نیا گاندھیائی رول اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ پہلا گاندھیائی رول ممکن تھا۔ تاہم دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ پہلا گاندھی ہیرو ازم کی بنیاد پہ اٹھا تھا، دوسرے گاندھی کو زیرو ازم کی بنیاد پر اٹھنے کا حوصلہ کرنا ہوگا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلا گاندھیائی رول بنیادی طور پر ایک سیاسی رول تھا جو غیر قوم کے خلاف ادا کیا گیا، دوسرا گاندھیائی رول بنیادی طور پر ایک غیر سیاسی رول ہے جس کو خود اپنی قوم کے اوپر ادا کرنا ہے۔ اور تاریخ کا اور خود گاندھی کا تجربہ بتاتا ہے کہ دوسروں کے خلاف بولنے والے کا استقبال پھولوں سے کیا جاتا ہے اور اپنوں کو مخاطب کرنے والے کا استقبال گولیوں سے۔

جو شخص آج دوسرے گاندھی کا رول ادا کرنے کے لیے اٹھے اس کو پیشہ ور سیاست دانوں (career politicians) کا طریقہ چھوڑ دینا ہوگا۔ وہ عوامی رجحان کے بجائے اصول کو اپنے سامنے رکھے گا۔ وہ اپنے فرقہ کے مفاد کے لیے بولنے کے بجائے قوم کے مفاد کے لیے بولے گا۔ وہ علاقائی خواہشات کے بجائے ملک کی وسیع تر مصلحتوں کو اپنا نشانہ بنائے گا۔ وہ ذاتی خوش نامی کو نظر انداز کر کے سچائی کا اعلان کرے گا۔ وہ وقتی تقاضوں کے بجائے مستقبل کے تقاضوں کو اہمیت دے گا۔

یہ چیزیں اس کو ہیرو شخصیت کے بجائے زیرو شخصیت بنا دیں گی۔ مگر دوسرا گاندھی بننے کی یہی واحد قیمت ہے اور جب تک ایسے حوصلہ مند افراد نہ اٹھیں دوسرے گاندھیائی کردار کی ادائگی بھی اس دیش میں ممکن نہیں۔

مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ میں کانگریس پارٹی میں شریک ہوئے۔ اس وقت انڈیا کی سیاست پر بال گنگا دھر تلک چھائے ہوئے تھے۔ تلک ہائی پروفائل میں بولنا پسند کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی ہمیشہ لو پروفائل میں بولتے تھے۔

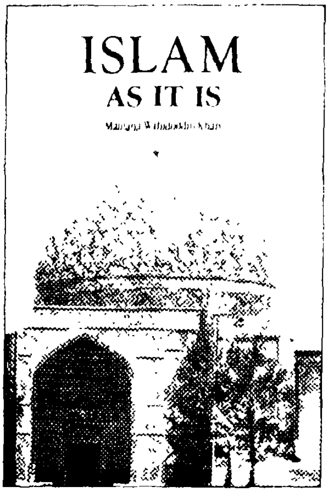
۱۱ اگست ۱۹۷۳ کو میری ملاقات نئی دہلی میں پرنسپل نرنجن سنگھ سے ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۱۹ کے اس امرت سر اجلاس میں موجود تھے جس میں مہاتما گاندھی شریک ہوئے۔ نرنجن سنگھ نے مجھے بتایا کہ کانگریس کے اس تاریخی اجلاس میں تلک، موتی لال، اینی بسنٹ، محمد علی جناح وغیرہ موجود تھے۔

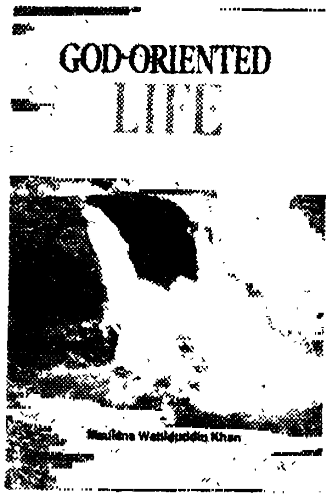
بڑے بڑے لیڈروں کے اس ماحول میں گاندھی جی بظاہر دیکھنے میں اتنے غیراہم معلوم ہوتے تھے کہ اسٹیج پر ان کو دیکھ کر اسکول کے لڑکوں نے کہا : یہ گھاس کاٹنے والا کہاں سے آگیا۔

تلک نے اس اجلاس میں مکمل سوراج کا رزولیوشن پیش کیا۔ دوسرا رزولیوشن گاندھی جی کا تھا۔ اس میں ڈومی نین اسٹیٹس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ تقریروں کے بعد ووٹنگ ہوئی تو تلک کو ۱۲۴ ووٹ ملے۔ اس کے مقابلہ میں گاندھی جی کو صرف چار ووٹ زیادہ ملے۔ ان کا رزولیوشن ۱۲۸ ووٹ سے منظور ہوا۔ اس وقت گاندھی کی یہ جیت اتنی عجیب تھی کہ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو لڑکوں نے نعرہ لگایا : وہ گھسیارا جیت گیا، وہ گھسیارا جیت گیا۔

یہ دورِ غلامی کی بات ہے۔ دورِ آزادی میں جو شخص گاندھی کا رول ادا کرنے کے لیے اٹھے گا اس کو مزید اضافہ کے ساتھ ہائی پروفائل کا اسلوب چھوڑنا ہوگا اور آخری حد تک لو پروفائل کے اسلوب کو اختیار کرنا ہوگا۔ حتی کہ عین ممکن ہے کہ اس عمل کے دوران لوگوں کی نظر میں وہ مسٹر جیت کے بجائے مسٹر ہار بن جائے۔ اور اس کے بارہ میں اسکول کے لڑکے یہ نعرہ لگائیں : مسٹر جیت گھسیارا بن گئے، مسٹر جیت گھسیارا بن گئے۔

انڈیا کی تعمیر نو کے لیے آج ایسے ہی مردان کار کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے قوموں کا مستقبل بنایا ہے اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو انڈیا کا مستقبل تعمیر کریں گے۔





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



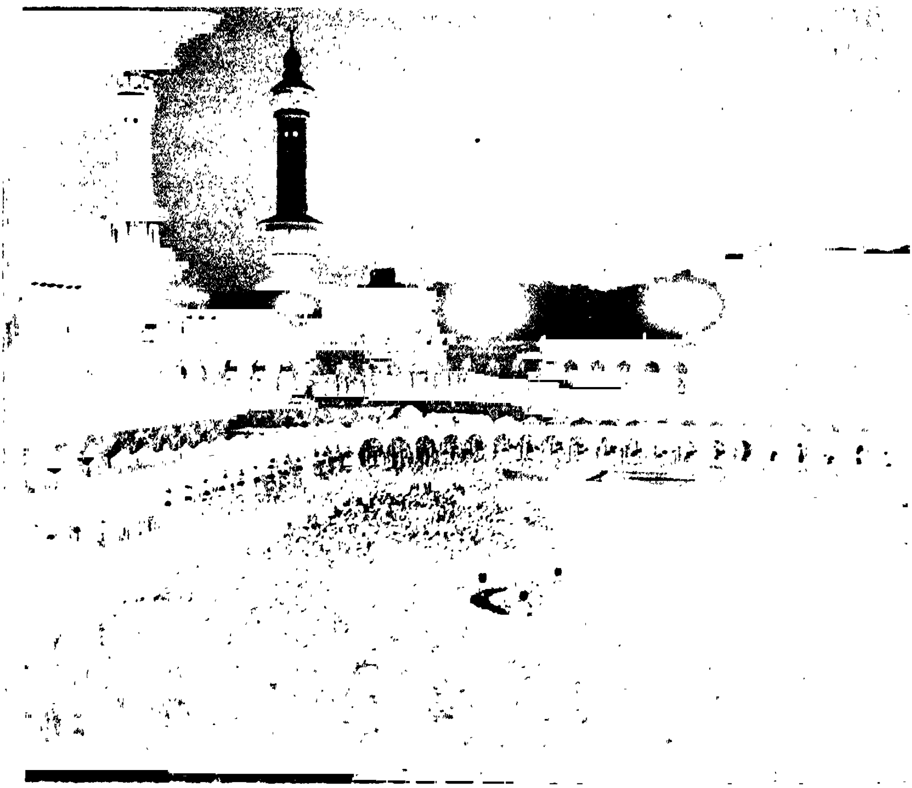
الرسالہ

Al-Risala

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز



THE HOLY MOSQUE IN MAKKAH

بھولنے والی بات کو بھلا دو تاکہ تم

یاد رکھنے والی بات کو یاد رکھ سکو

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۴ شمارہ ۲۱۱

AL-RISALA (Urdu) Monthly

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333

Fax : 91-11-4697333

Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-Mail)

Printed by Nice Printing Press, Delhi

صبر یا بے صبری

کسی آدمی کے ساتھ آپ کا مسئلہ پیدا ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ خود اس کے حل کی ذمہ داری قبول کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ مسئلہ کے حل کی ذمہ داری دوسرے آدمی کے اوپر ڈالیں۔ پہلا طریقہ صبر کا طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ بے صبری کا طریقہ۔

صبر کا مطلب خود ذمہ داری قبول کرنا ہے، اور بے صبری کا مطلب دوسرے کے اوپر ذمہ داری ڈالنا۔ یہی مختصر الفاظ میں صبر اور بے صبری کا خلاصہ ہے۔

صبر آدمی کے اندر مثبت نفسیات پیدا کرتا ہے۔ صبر والا آدمی پیش آمدہ صورت حال کو چیلنج سمجھتا ہے اور اس سے مقابلہ کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت کو محنت اور عمل کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ اور اپنے اثاثہ کا ہر ذرہ تعمیر کے راستوں میں لگاتا ہے۔ نئے حالات کا جھٹکا اس کو ازسرِ نو بیدار کر دیتا ہے، بھرپور جد وجہد کے ذریعہ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔

اس کے برعکس بے صبر آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی پوری سوچ منفی ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن احتجاج اور شکایت کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اپنے اثاثہ کو تعمیر خویش کے بجائے تخریب غیر کے محاذ پر لگا دیتا ہے، وہ اپنی کمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے کو کام سمجھ کر اس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ اپنی بے علمی سے محروم ہوا تھا تو اب وہ غلط عمل کی بنا پر اپنے کو مزید محروم کر لیتا ہے۔

صبر کا مطلب سوچ کر کرنا ہے اور بے صبری کا مطلب بے سوچے سمجھے کرنا۔ صبر منصوبہ بند عمل ہے اور بے صبری عجلت کی کارروائی۔ صبر حالات کا اندازہ کر کے حالات سے نپٹنا ہے اور بے صبری حالات کا اندازہ کیے بغیر حالات میں کود پڑنا۔ صبر دانش مندانہ تدبیر ہے اور بے صبری جذباتی ہنگامہ آرائی۔ صبر انجام کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے متحرک ہونا ہے اور بے صبری انجام کار سے بے پروا ہو کر حرکت میں آ جانا۔

صبر گویا اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جاننا ہے اور بے صبری گویا صرف اپنے آپ کو جاننا۔ پہلا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور دوسرا آدمی ہمیشہ ناکام۔

نماز کی طاقت

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانی سلطنت سے ٹکراؤ ہوا۔ اس جنگ میں ایران کا سپہ سالار رستم تھا۔ علامہ ابن خلدون نے رستم کے بارہ میں لکھا ہے :

رستم کا حال یہ تھا کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتا کہ وہ نماز کے لیے اکٹھا ہو رہے ہیں تو وہ کہتا کہ عمر میرا کلیجہ کھا گیا۔ وہ کتوں کو آداب سکھا رہا ہے۔	کان رستمٌ اذا رأیٰ المسلمینَ یجتمعون للصلاۃ یقول : اکل عمرُ کبدی، یُعلّمُ الکلاب الآداب (مقدمہ ابن خلدون ۱۵۲)

اس زمانہ میں ایران میں مسجدیں نہیں تھیں۔ مسلم فوجیں میدانوں میں نماز پڑھتی تھیں۔ لوگ میدان میں جمع ہوتے۔ قاعدہ کے مطابق، ایک آدمی بطور امام آگے کھڑا ہوتا۔ بقیہ تمام لوگ صف باندھ باندھ پیچھے کھڑے ہو جاتے۔ رستم دیکھتا کہ تمام لوگ منظم ہو کر ایک امام کی پیروی میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جھکتے ہیں۔ زمین پر اپنا سر رکھتے ہیں۔ رستم محسوس کرتا کہ اسلامی خلیفہ کے حکم کے تحت یہ مسلم فوج کو ڈسپلن کی تربیت دی جارہی ہے۔ وہ آداب حیات (rules of behaviour) کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح ڈسپلن اور آداب حیات کی تربیت حاصل کر لیں وہ اتنے طاقت ور ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی انھیں زیر نہیں کر سکتا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جتنے مسلمان نماز پڑھتے تھے، آج گنتی کے اعتبار سے اس سے بہت زیادہ لوگ ساری دنیا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کی نماز کو دیکھ کر قوموں کے اوپر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر آج کے مسلمانوں کی نماز میں اس قسم کی انقلابی تاثیر موجود نہیں۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کی نماز فی الواقع آداب حیات سیکھنے کے ہم معنی تھی۔ مگر آج کے مسلمانوں کی نماز بے روح رسم کے ہم معنی ہے۔ بظاہر آج بھی لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آج بھی وہ ایک امام کی پیروی میں اٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ لیکن وہ اگر زندہ فعل تھا تو یہ بے روح رسم ہے، اور بے روح رسم کبھی زندہ عمل کے برابر نہیں ہو سکتی۔

دانش مندانہ طریقہ

جارجز بیدال (۱۹۸۳-۱۸۹۹) ایک فرانسیسی لیڈر تھا۔ وہ اگرچہ ایک استعمار پسند آدمی تھا۔ تاہم اس کے بعض اقوال بہت دانش مندانہ ہیں۔ اس نے ایک بار کہا کہ کمزور کے پاس ایک زبردست ہتھیار ہوتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی غلطیاں ہیں جو اپنے بارہ میں سوچتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہیں :

The weak have one weapon; the errors of thos
who think they are strong. (George Bidault)

جب کوئی شخص یا گروہ اپنے آپ کو طاقت ور سمجھ لے تو اس کے اندر لازمی طور پر ایک "کمزور عنصر" پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی حیثیت کا مبالغہ آمیز اندازہ ہے۔ وہ اپنی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بنا پر ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے تقاضوں کو قابو میں رکھنا اس کے بس میں نہ ہو۔ اس طرح وہ خود اپنی پیدا کردہ مشکلات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا امکان ہے جو کمزور فریق کے پاس اپنے طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مگر اس امکان کو واقعی طور پر استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کمزور فریق آخری حد تک صبر کی روش پر قائم رہے۔ وہ خاموش رہ کر فریق ثانی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرے۔ وہ صرف اس وقت حرکت میں آئے کہ جب کہ فریق ثانی غلط اقدام کرکے اپنے آپ کو ناقابل عبور مشکلات میں پھنسا چکا ہو۔

اسلام کی تاریخ میں غزوۂ خندق اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ مکہ کے مخالفین اسلام نے اپنی طاقت کے زعم میں آکر ایک بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ سفر کرکے مدینہ پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یہ ان کے لیے ایک غلط اقدام تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "خندق" کی صورت میں اعراض کی پالیسی اختیار کی۔ مدینہ سے نکل کر جوابی حملہ کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کے اندر ٹھہر کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

یہ طریقہ انتہائی کامیاب رہا۔ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر آیا اور حملہ آوروں کو طوفان کے تنکے کی طرح بہالے گیا۔

دو دنیائیں

سرآرتھر ایڈنگٹن (Arthur S. Eddington) مشہور انگریز سائنس داں ہے۔ وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۴۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ——— طبیعاتی دنیا کی نوعیت :

The Nature of the Physical World (1928)

ایڈنگٹن نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ میں اپنی کرسی پر جس میز کے سامنے بیٹھا ہوں وہ دو میز (two tables) ہے۔ ایک میز وہ جو دکھائی دے رہی ہے۔ دوسری میز وہ جو دکھائی نہیں دیتی۔ دکھائی دینے والی میز بظاہر ٹھوس ہے۔ مگر دوسری میز جو دکھائی نہیں دیتی، اس میں بے شمار غیر مرئی الکٹران ہر لمحہ حرکت کر رہے ہیں۔ یہی حال پوری دنیا کا ہے۔ اس دنیا کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا اس کا باطن ہے۔ عالم ظاہر کو ہم دنیا کہتے ہیں، اور عالم باطن کا نام آخرت ہے۔ موت عالم ظاہر سے نکل کر عالم باطن میں داخل ہونے کا نام ہے۔

موجودہ ظاہری دنیا آدمی کو دکھائی دیتی ہے، مگر دوسری، اس کے اندر چھپی ہوئی دنیا آدمی کو دکھائی نہیں دیتی۔ اس بنا پر انسان موجودہ دنیا کو حقیقی جانتا ہے، اور دوسری دنیا کو خیالی سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ آخرت کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بھی اس کو بس دور کے ایک عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کے باوجود وہ ان کی عملی اور حقیقی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

یہی انسان کی سب سے بڑی غفلت ہے۔ انسان وقتی دنیا میں مشغول ہو کر مستقل دنیا کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ عارضی دنیا میں کھویا ہوا ہے اور ابدی دنیا کو غیر اہم چیز کی طرح چھوڑے ہوئے ہے۔ وہ اپنے آج کی خاطر اپنے کل کو کھو رہا ہے۔ موت کے دن جب آدمی اِس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگا تو یہ اس کے لیے گویا پردہ ہٹنے کا دن ہوگا۔ اس دن وہ اپنی غفلت پر افسوس کرے گا۔ مگر اس دن اس کا افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا۔

سائنسداں اپنی "دو میزوں" کو اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے، اس کے بعد ہی وہ سائنسداں بنتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی آج کی زندگی میں "دو دنیاؤں" کو دریافت کر لے وہی صاحب معرفت ہے اور وہی خدا کی توفیق سے اگلے مرحلۂ حیات میں کامیاب ہوگا۔

دانش مندانہ طریقہ

جارجز بیدال (۱۹۸۳ - ۱۸۹۹) ایک فرانسیسی لیڈر تھا۔ وہ اگرچہ ایک استعمار پسند آدمی تھا۔ تاہم اس کے بعض اقوال بہت دانش مندانہ ہیں۔ اس نے ایک بار کہا کہ کمزور کے پاس ایک زبردست ہتھیار ہوتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی غلطیاں ہیں جو اپنے بارہ میں سوچتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہیں :

The weak have one weapon; the errors of thos
who think they are strong. (George Bidault)

جب کوئی شخص یا گروہ اپنے آپ کو طاقت ور سمجھ لے تو اس کے اندر لازمی طور پر ایک "کمزور عنصر" پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی حیثیت کا مبالغہ آمیز اندازہ ہے۔ وہ اپنی بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بنا پر ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے تقاضوں کو قابو میں رکھنا اس کے بس میں نہ ہو۔ اس طرح وہ خود اپنی پیدا کردہ مشکلات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا امکان ہے جو کمزور فریق کے پاس اپنے طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مگر اس امکان کو واقعی طور پر استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کمزور فریق آخری حد تک صبر کی روش پر قائم رہے۔ وہ خاموش رہ کر فریق ثانی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرے۔ وہ صرف اس وقت حرکت میں آئے کہ جب کہ فریق ثانی غلط اقدام کر کے اپنے آپ کو ناقابل عبور مشکلات میں پھنسا چکا ہو۔

اسلام کی تاریخ میں غزوۂ خندق اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ مکہ کے مخالفین اسلام نے اپنی طاقت کے زعم میں آکر ایک بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ سفر کر کے مدینہ پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یہ ان کے لیے ایک غلط اقدام تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "خندق" کی صورت میں اعراض کی پالیسی اختیار کی۔ مدینہ سے نکل کر جوابی حملہ کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کے اندر ٹھہر کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

یہ طریقہ انتہائی کامیاب رہا۔ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر آیا اور حملہ آوروں کو طوفان کے تنکے کی طرح بہا لے گیا۔

دو دنیائیں

سرآرتھر ایڈنگٹن (Arthur S. Eddington) مشہور انگریز سائنس داں ہے۔ وہ ۱۸۸۲ء
میں پیدا ہوا، اور ۱۹۴۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے —————
طبیعاتی دنیا کی نوعیت :

The Nature of the Physical World (1928)

ایڈنگٹن نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ میں اپنی کرسی پر جس میز کے سامنے بیٹھا ہوں وہ دو میز (two tables) ہے۔ ایک میز وہ جو دکھائی دے رہی ہے۔ دوسری میز وہ جو دکھائی نہیں دیتی۔ دکھائی دینے والی میز بظاہر ٹھوس ہے۔ مگر دوسری میز جو دکھائی نہیں دیتی، اس میں بے شمار غیر مرئی الکٹران ہر لمحہ حرکت کر رہے ہیں۔ یہی حال پوری دنیا کا ہے۔ اس دنیا کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا اس کا باطن ہے۔ عالم ظاہر کو ہم دنیا کہتے ہیں، اور عالم باطن کا نام آخرت ہے۔ موت عالم ظاہر سے نکل کر عالم باطن میں داخل ہونے کا نام ہے۔

موجودہ ظاہری دنیا آدمی کو دکھائی دیتی ہے، مگر دوسری، اس کے اندر چھپی ہوئی دنیا آدمی کو دکھائی نہیں دیتی۔ اس بنا پر انسان موجودہ دنیا کو حقیقی جانتا ہے، اور دوسری دنیا کو خیالی سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ آخرت کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بھی اس کو بس دور کے ایک عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کے باوجود وہ ان کی عملی اور حقیقی زندگی پر اثرانداز نہیں ہوتا۔

یہی انسان کی سب سے بڑی غفلت ہے۔ انسان وقتی دنیا میں مشغول ہو کر مستقل دنیا کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ عارضی دنیا میں کھویا ہوا ہے اور ابدی دنیا کو غیر اہم چیز کی طرح چھوڑے ہوئے ہے۔ وہ اپنے آج کی خاطر اپنے کل کو کھو رہا ہے۔ موت کے دن جب آدمی اِس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگا تو یہ اس کے لیے گویا پردہ ہٹنے کا دن ہوگا۔ اس دن وہ اپنی غفلت پر افسوس کرے گا۔ مگر اس دن اس کا افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا۔

سائنسداں اپنی "دو میزوں" کو اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے، اس کے بعد ہی وہ سائنسداں بنتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی آج کی زندگی میں "دو دنیاؤں" کو دریافت کر لے وہی صاحب معرفت ہے اور وہی خدا کی توفیق سے اگلے مرحلۂ حیات میں کامیاب ہوگا۔

مفلس کون

ایک بزرگ ایک بستی میں رہتے تھے۔ اس بستی میں غیر قوم کا ایک آدمی آیا۔ بستی والوں نے اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ جب بات بڑھی تو بستی والوں نے اس کو اپنے لیے قومی عزت کا مسئلہ بنالیا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ اس معاملہ میں اپنے ظلم کو چھپالیں۔ اب ہر ایک نے اصل قصہ کو بدل کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا جس میں سارا قصور صرف غیر قوم کے آدمی کا ثابت ہو۔ بستی والے اس پورے معاملہ میں بالکل معصوم اور بے قصور نظر آئیں۔

اس معاملہ میں مذکورہ بزرگ سے پوچھا گیا تو انھوں نے واقعہ کی اصل حقیقت بتادی۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں سارا قصور بستی والوں کا ہے، اور غیر قوم کا آدمی اس معاملہ میں مظلوم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس پر بستی کے لوگ بزرگ موصوف پر خفا ہو گئے۔ اس سے پہلے مذکورہ بزرگ بستی کے اندر نہایت محترم حیثیت رکھتے تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ مگر اب ہر ایک نے ان کو برا کہنا شروع کر دیا۔ ان کو حقیر کیا گیا۔ ان پر جھوٹے الزام لگائے گئے۔ حتی کہ کچھ لوگوں نے یہ بہتان بھی لگایا کہ بزرگ نے غیر قوم سے پیسہ لے لیا ہے، اس لیے وہ ان کی طرفداری کر رہے ہیں۔ وغیرہ۔

بزرگ کے خلاف ساری بستی میں اس قسم کے جھوٹے پروپگنڈے جاری تھے۔ لیکن بزرگ نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے معمول کے کاموں میں لگے رہے۔ آخر ایک روز بستی کا ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ آپ کے خلاف اتنا زیادہ پروپگنڈا کیا جارہا ہے اور آپ چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔ کیا آپ کو اپنی بدنامی پر کوئی پریشانی نہیں۔

بزرگ نے جواب دیا کہ مجھ کو پریشانی کیوں ہو۔ میں تو بالکل مطمئن ہوں۔ کیوں کہ یہ لوگ تو ایسا کر کے میرے گناہوں کو بانٹ رہے ہیں۔ وہ میرے گناہوں کا بوجھ مجھ سے اتار کر اس کو اپنے اوپر لے رہے ہیں۔ وہ مجھ کو اس قابل بنا رہے ہیں کہ میں ہلکا ہو کر آخرت کی دنیا میں داخل ہوں۔ اس کے بعد بزرگ نے یہ حدیث سنائی:

عن أبي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه انَّ رسُولَ الله صلى الله عليه وسلّم قال: "أتدرُون ما المفلِس؟" قالُوا: المفلِسُ فينا مَن لا دِرهمَ له ولا متاع - فقال: "إنَّ المفلس من أُمّتي مَن يأتي يوم القيامَةِ بِصلاةٍ وصيامٍ و زكاةٍ، و يأتي قد شَتمَ هذا، وقذف هذا، و أكلَ مال هذا، وَسفكَ دَمَ هذا، وضرب هذا، فيُعطى هذا من حسَناتِه، وهذا من حسناتِه، فان فَنِيَتْ حسَناتُهُ قبل ان يُقضى ما عليهِ أُخِذَ من خطاياهُم فطُرِحت عليه ثم طُرِح في النار"۔ (رواه مسلم)

حضرت ابوہریرہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے اور اسی کے ساتھ اس نے کسی کو برا کہا ہو اور کسی پر الزام لگایا ہو اور کسی کا مال کھایا ہو اور کسی کا خون بہایا ہو اور کسی کو مارا ہو۔ پھر اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں۔ اور اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں اور حساب برابر نہ ہوا ہو تو مظلوموں کی گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے اور پھر اس کو آگ میں پھینک دیا جائے۔

یہ حدیث ایک طرف ان لوگوں کے لیے نہایت سخت ڈراوا ہے جو دوسرے انسانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ جو دوسروں کے خلاف غصب، بہتان، الزام تراشی جیسے جرائم میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان کے اعمال نامہ میں کوئی نیکی ہو تو آخرت کے دن وہ نیکی ان کے کام آنے والی نہیں۔ اور اگر ان کے پاس نیکی نہ ہو تو ان کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی ان کے اوپر ڈال دیا جائے۔

دوسری طرف اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے تسکین کا سامان ہے جو مظلوم ہیں۔ جن کو ناحق ستایا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کو آخرت میں یہ خوش قسمتی ملنے والی ہے کہ ان کے گناہوں کا بوجھ ان کے ظالموں پر ڈال دیا جائے اور وہ ہلکے پھلکے ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ یہ انجام ان کے لیے اس وقت ہے جب کہ انھوں نے اپنی مظلومیت پر اللہ کی خاطر صبر کر لیا ہو۔

جواز چھین لیجئے

ہندستان میں جنگ آزادی کے دو دور ہیں۔ ایک ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۲۰ تک۔ دوسرا ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۷ تک۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ پہلے دور میں انگریزی حکومت نے آزادی کی مانگ کرنے والوں پر وحشیانہ مظالم کیے۔ مگر یہی انگریز ۱۹۲۰ کے بعد وحشیانہ مظالم کرنے سے رک گئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ پہلے دور میں آزادی کی تحریک چلانے والے اپنی تحریک کو تشدد کے طریقہ پر چلا رہے تھے۔ مگر ۱۹۲۰ سے اس تحریک کے قائد مہاتما گاندھی بن گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ آزادی کی تحریک کو ہم عدم تشدد کے اصول پر چلائیں گے۔

مہاتما گاندھی نے جب تشدد کو ترک کیا تو اس کے ساتھ ہی انگریزی حکومت کا تشدد بھی ختم ہوگیا۔ کیوں کہ تشدد کرنے کے لیے ہمیشہ اس کا جواز (justification) درکار ہوتا ہے۔ پچھلے لوگ اپنے تشدد سے انگریز کو بھی تشدد کا جواز دے رہے تھے۔ جب آزادی کی مانگ کرنے والوں نے تشدد کو چھوڑا تو انھوں نے عین اسی وقت انگریز سے بھی اپنے خلاف تشدد کا جواز چھین لیا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے جب ایسا کیا تو ایک انگریز کلکٹر نے برٹش سکریٹریٹ کو تار دیا کہ براہ کرم بذریعہ تار بتائیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح مارا جائے :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد کا جو مسئلہ ہے، اس کے حل کے لیے کچھ لوگ دفاع کا مشورہ دے رہے ہیں۔ یہ بالکل الٹا مشورہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دفاع اس مسئلہ کو صرف بڑھانے والا ہے، اور وہ کسی بھی درجہ میں اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس مسئلہ کا ایک ہی یقینی حل ہے۔ وہ یہ کہ ظالم سے ظلم کا جواز چھین لیا جائے۔ ایک فریق جب سازش کے تحت اشتعال انگیزی کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ فریق ثانی اس سے بھڑک اٹھے۔ وہ مشتعل ہو کر کوئی جوابی کارروائی کرے۔ ایسے موقع پر جوابی کارروائی کرنا ظالم کو ظلم کا جواز فراہم کرنا ہے۔ اس وقت آپ تحمل سے کام لیجئے۔ آپ جوابی کارروائی نہ کیجئے۔ اس کے بعد آپ ظالم سے ظلم کا جواز چھین لیں گے۔ اور ظالم سے جب ظلم کا جواز چھین لیا جائے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہاتھ میں بندوق رکھتے ہوئے بھی وہ آپ پر فائر نہ کر سکے۔

آزادئ فکر

والٹر لپمان (Walter Lippmann) ۱۸۸۹ میں نیویارک میں پیدا ہوا، ۱۹۷۴ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اپنی سیاسی اور صحافتی تحریروں کے ذریعہ اس نے شہرت پائی۔ اس کی کتاب رائے عامہ (Public Opinion) بہت مقبول ہوئی۔ وہ پہلی بار ۱۹۲۲ میں چھپی تھی۔ اس نے سیاست میں نفسیاتی اپروچ اختیار کرنے پر زور دیا۔

والٹر لپمان اپنے سنجیدہ افکار کی بنا پر کافی پڑھا جاتا تھا۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ —— جب تمام لوگ ایک طرح سوچیں تو کوئی بھی شخص بہت زیادہ نہیں سوچتا :

When all think alike, no one thinks very much.

اس قول میں سادہ الفاظ میں بہت اہم بات کہہ دی گئی ہے۔ سوچنے اور جاننے کی باتیں اس دنیا میں بے شمار ہیں۔ اگر لوگوں کو سوچنے کی آزادی ہو تو ہر آدمی مختلف رخ پر سوچے گا۔ اس طرح مجموعی طور پر لوگ بہت زیادہ باتوں کو جان لیں گے۔ اور اگر ایسا ماحول بنا دیا جائے جس میں تمام لوگ ایک ہی رخ پر سوچیں تو ایسے ماحول میں لوگوں کی مجموعی واقفیت بھی بہت کم ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں فکری آزادی ہو۔ اختلاف اور تنقید کو پسند کیا جاتا ہو، وہاں علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں زندہ انسان ابھرتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں فکری آزادی نہ ہو، جہاں اختلاف اور تنقید کو برا سمجھا جاتا ہو وہاں علم کی ترقی رک جاتی ہے۔ لوگوں کے اندر ذہنی جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ اس ذہنی پستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کو ایک شخص نے "ذہنی بونا پن" سے تعبیر کیا ہے۔

جب لوگوں کو اپنے اپنے انداز پر سوچنے کی آزادی ہوگی تو لازماً اختلاف رائے پیدا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر تنقید کریں گے۔ اب جو شخص تنقید کی مخالفت کرے وہ سادہ طور پر تنقید کا مخالف نہیں ہے بلکہ وہ ذہنی ارتقاء کا مخالف ہے۔ یاد رکھئے، اس دنیا میں ہمارے لیے انتخاب (Option) تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے، بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ اگر آپ تنقید کو بند کریں تو جو چیز باقی رہے گی وہ ذہنی جمود ہوگا نہ کہ بے تنقید۔

تنقید کے ماحول میں ذہنی ارتقاء ہوتا ہے، اور بے تنقید ماحول میں ذہنی جمود۔

غصّہ میں

البتانو (Albetano) ایک قدیم رومی فلسفی ہے۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ جو آدمی غصہ میں ہو وہ ہمیشہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کر سکتا ہے جتنا کہ فی الواقع وہ کر سکتا ہے :

The angry man always thinks he can do more than he can.

ایک آدمی شراب کے نشہ میں ہو تو وہ آپے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ اپنا سر پتھر سے ٹکرا دیتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں پتھر نہ ٹوٹے بلکہ خود اس کا سر ٹوٹ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب سے سرمست ہو کر وہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر لیتا ہے۔ وہ ایسا اقدام کر بیٹھتا ہے جس کا انجام خود اس کے خلاف نکلنے والا ہو۔

یہی معاملہ غصہ کا ہے۔ غصہ کی حالت میں آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے جتنا کہ واقعتہً وہ ہے۔ اس غلط اندازہ کی بنا پر وہ ایسی کارروائی کر گزرتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہوتی ہے۔ اس نادانی کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا غصہ اتر جائے۔ مگر اب غلط اقدام کے نتیجہ میں آنے والی تباہی آچکی ہوتی ہے۔ اس لیے اب صرف افسوس اس کے حصہ میں آتا ہے نہ کہ غلط کارروائی کے انجام سے حفاظت۔

اس کی ایک واضح مثال ہندستان میں پولیس اور مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے مسلمان پولیس پر غصہ ہو جاتے ہیں اور اس سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اس ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ مسلمانوں کے یک طرفہ نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ کا سبب یہی ہے کہ غصہ کی وجہ سے مسلمان اپنا اور مسلح پولیس کا فرق سمجھ نہیں پاتے۔ اگر وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچیں تو وہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کریں گے اور کبھی بھی پولیس سے نہ ٹکرائیں گے۔ مگر غصہ کی بنا پر وہ اپنی طاقت کا زیادہ اندازہ کر لیتے ہیں اور غیر ضروری طور پر پولیس سے لڑنے لگتے ہیں اور پھر یک طرفہ طور پر نقصان اٹھاتے ہیں۔

غصہ کی حالت میں کبھی اقدام نہ کیجئے۔ فریق ثانی کے مقابلہ میں اپنی کارروائی ہمیشہ اس وقت کیجئے جب کہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہو۔ اس کے بعد آپ بیشتر نقصانات سے اپنے آپ بچ جائیں گے۔

زندگی کا معاملہ

بازار میں تمام چیزیں ضروری قیمت دینے کے بعد ملتی ہیں۔ بازار کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے ——— جتنا دینا، اتنا پانا۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ یہی اصول پوری انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ تم دنیا کو اپنا بہترین دو، اور تمہاری طرف بھی دنیا کا بہترین واپس آئے گا:

Give the world the best you have, and the best will come back to you.

اگر آپ لوگوں کے خیر خواہ ہوں تو لوگ بھی آپ کے خیر خواہ ہوں گے۔ اگر آپ لوگوں سے میٹھا بول بولیں تو لوگوں کی طرف سے بھی آپ کو میٹھے بول کا تحفہ ملے گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والے بنیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ محبت کرنے والے بن جائیں گے۔

یہ دنیا لین دین کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی وہی پاتا ہے جو اس نے دوسروں کو دیا ہو۔ یہاں دوسرے لوگ کسی آدمی کے لیے وہی کچھ ثابت ہوتے ہیں جو کہ وہ خود دوسروں کے لیے ثابت ہوا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اچھا ماحول پانا آدمی کے اپنے اختیار میں ہے۔ آپ دوسروں کے دوست بن جائیے، اس کے بعد آپ کو بھی دوستوں سے بھرا ہوا ماحول مل جائے گا۔ آپ دوسروں کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کیجئے، اس کے بعد آپ بھی اپنے گردو پیش ایسے پڑوسی پالیں گے جو آپ کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کریں۔ آپ دوسروں کو فائدہ پہنچائیے، اس کے بعد آپ کو بھی زندگی گزارنے کے لیے ایسی دنیا مل جائے گی جہاں ہر ایک آپ کو فائدہ پہنچانے میں مصروف ہوگا۔

اگر آپ پھول بن کر رہنا جانتے ہوں تو آپ خود بخود اپنے رہنے کے لیے پھولوں کی کیاری پالیں گے۔ اور اگر آپ کے وجود کے ساتھ کانٹے لگے ہوئے ہوں تو اس کے بعد آپ کو زندگی گزارنے کے لیے جو دنیا ملے گی وہ صرف کانٹوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہوگا۔

اس کا سبب

یہ ایک واقعہ ہے کہ انڈیا کے مسلمان، ہندوؤں کے مقابلہ میں، تعلیم اور اقتصادیات میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس کی توجیہ کرتے ہوئے ایک ہندو دانشور (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ فروری ۱۹۹۲) نے لکھا ہے کہ آزاد ہندستان میں ہندو خوش حال ہیں، کیوں کہ ان کے مذہب نے جدیدیت اور ترقی کے راستہ کو اپنایا۔ جب کہ مسلمان پس ماندہ رہ گئے، کیوں کہ ان کا مذہب صرف ماضی کی طرف دیکھتا رہا :

Hindus have prospered in independent India because their religion adopted the road to modernity and progress, while Muslims remained backward because their religion turned its gaze towards the past.

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذکورہ فرق بجائے خود ایک واقعہ ہے۔ مگر اس کی مذکورہ توجیہہ درست نہیں۔ اسلام ہرگز یہ نہیں سکھاتا کہ تم پیچھے کی طرف دیکھتے رہو، اور ترقی کی باتوں کو نظر انداز کر دو۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا سبب ان کے نااہل لیڈر ہیں، نہ کہ اسلام۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب نئی ترقیوں کا ظہور ہوا تو عین اس وقت ایک اور واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنا سیاسی اقتدار اور تہذیبی برتری کھو دی۔ مغربی قومیں جو نئی ترقیوں کو لائی تھیں، وہی وہ قومیں بھی تھیں جنھوں نے ساری دنیا میں مسلمانوں کو مغلوب کر کے ان کے اوپر اپنا سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کر لیا تھا۔

ہمارے اس دور کے لیڈروں نے ساری دنیا میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی تحریکیں کھڑی کر دیں۔ انھوں نے خود بھی مغربی قوموں سے نفرت کی اور مسلمانوں کو بھی ان کے خلاف نفرت میں مبتلا کر دیا۔ یہی نفرت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے لیے جدید ترقیات کے میدان میں آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا سبب اسلام نہیں ہے، بلکہ وہ مصنوعی نفرت ہے جو ہمارے ناعاقبت اندیش لیڈروں نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی۔ یہی نفرت اس میں رکاوٹ بن گئی کہ مسلمان مغربی قوموں کو اعتدال وانصاف کی نظر سے دیکھیں اور ان کی طرف سے آنے والی ترقیاتی چیزوں کو اختیار کر لیں۔

یہ انسان

بلیز پاسکل ایک فرانسیسی فلسفی اور سائنس داں ہے۔ وہ ۱۶۲۳ میں پیدا ہوا، اور ۱۶۶۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ——— وسیع خلا کے اعتبار سے کائنات میرا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایٹم کی مانند مجھ کو نگلے ہوئے ہے۔ مگر خیال کے اعتبار سے میں اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہوں :

By space the universe encompasses and swallows me as an atom; by thought I encompass it. (Blaise Pascal)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو متضاد صفت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ایک طرف اس کا ذہن ہے۔ اپنی ذہنی سوچ کے اعتبار سے انسان اپنے آپ کو لا محدود پاتا ہے۔ وہ سب کچھ سوچ سکتا ہے۔ ہر طرف اپنا خیال دوڑا سکتا ہے، اس کے خیال پر بظاہر یہاں کوئی حد بندی نہیں۔

مگر اپنے جسمانی وجود کے اعتبار سے انسان انتہائی محدود ہے۔ وہ بے شمار قسم کی محدودیتوں میں بندھا ہوا ہے، اور سب سے بڑی محدودیت جس سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ موت ہے۔ موت آدمی کی ہر بڑائی کی نفی کر دیتی ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس میں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ آدمی کو عظمتوں کے درمیان اپنے بے عظمت ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ اس کو لا محدود کی فضا سے نکل کر اپنے محدود ہونے کا علم حاصل کرنا ہے۔ اس کو آزادی کے ماحول میں پابندی کو قبول کرنا ہے۔

انسان اس دنیا میں حالتِ امتحان میں ہے۔ اس کا امتحان میں پورا ہونا یہ ہے کہ وہ فکری وسعت کے باوجود اپنی عملی محدودیت کو جانے۔ وہ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے بچائے۔ وہ اپنے آزاد ارادہ کو حقیقت پسندی کے دائرہ میں استعمال کرے۔

جانور کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا جتنا عمل ہے اتنا ہی ان کی سوچ۔ اس لئے جانوروں کا معاملہ زندہ مشین جیسا ہے۔ مگر انسان کی سوچ کی حد اس کے عمل کی حد سے بہت زیادہ ہے۔ سوچ اور عمل کے اس فرق میں توازن کو پا لینے ہی کا نام اعلیٰ انسانیت ہے۔

صبر اور دعوت

صبر داعی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کر سکے۔ جو آدمی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس دنیا میں کبھی داعی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

سر جیمز جینز مشہور انگریز سائنسداں ہے۔ اس نے طبیعیات اور فلسفہ (Physics & philosophy) کے نام سے ۱۹۴۱ میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے اعتراف کیا کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کا ہینڈل حاصل کر سکیں :

It almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

انگریز سائنس داں نے جس وقت یہ سطریں لکھی ہیں عین اس وقت ساری دنیا کے مسلمان انگریزوں کی سیاسی بالادستی پر بھڑک کر ان کے خلاف خوں آشام لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ انگریز کو صرف ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ انگریز کی سیاسی بالادستی پر وقتی طور پر صبر کر لیتے تو اچانک انھیں دکھائی دیتا کہ انگریز قوم حقیقت کے دروازے کھولنے کے لیے جس "ہینڈل" کی تلاش کر رہی ہے وہ ہینڈل ان کے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

اس واقفیت کی صورت میں انگریز کے بارے میں ان کی پوری نفسیات بدل جاتی۔ اب وہ انگریز کو اپنا مدعو سمجھتے نہ کہ اپنا حریف۔ اس کے بعد وہ انگریز کی ہلاکت چاہنے کے بجائے اس کی ہدایت چاہنے لگتے۔ وہ انگریز کی اصلاح کے لیے دعا کرتے اور اس کے خیر خواہ بن کر اس سے یہ کہتے کہ حقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے تم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ تمہارے خدا نے پیشگی طور پر قرآن کی صورت میں تمہارے لیے بھیج دیا ہے۔

صبر دعوت کی لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر نہ ہو وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔

مسلمان اور جدید تحدیات

موجودہ زمانہ کے مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسائل کا شکار ہیں۔ ان مسائل کے خلاف ان کی جدوجہد ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت مسلم رہنماؤں کا عام ذہن یہ تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب مغربی قوموں کا سیاسی غلبہ ہے۔ اگر مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو جائے تو اس کے بعد ہمارے تمام مسائل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

ایشیا کے مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسائل کا شکار ہیں، اس کے خلاف ان کی جدوجہد ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت مسلم رہنماؤں کا عام ذہن یہ تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب مغربی قوموں کا سیاسی غلبہ ہے۔ اگر مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو جائے تو اس کے بعد ہمارے مسائل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ اس کے بعد تمام مسلم علاقے مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل ختم نہیں ہوئے۔ وہ بدستور پوری شدت کے ساتھ آج بھی باقی ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا غلبہ سادہ طور پر صرف سیاسی غلبہ نہ تھا۔ وہ دراصل جدید صنعتی تہذیب کا نتیجہ تھا۔ سیاسی غلبہ کے خاتمہ کے باوجود صنعتی تہذیب کی فاتحانہ حیثیت بدستور انھیں مغربی قوموں کو حاصل تھی، اس لیے ان کا غلبہ بھی بدستور جاری رہا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ غلبہ براہ راست تھا، اور اب یہ غلبہ بالواسطہ انداز میں ہے۔

اس منفی انجام کو دیکھنے کے بعد کچھ مسلم دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری اصل کمی صنعتی پس ماندگی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کمی کو دور کرنا ہوگا۔ ہمیں دوسری قوموں کی طرح ایک بڑی صنعتی طاقت بننا ہے۔ اس کے بغیر ہماری قسمت بدلنے والی نہیں۔

مگر یہ بھی ہمارے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ کیوں کہ زمانہ ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم صنعتی ترقی کی طرف بڑھنا شروع کریں تو ساری کوشش کے بعد جب ہم انڈسٹریل دور میں داخل ہوں گے تو، الون ٹافلر کے الفاظ میں، مغربی قومیں سپر انڈسٹریل

دور میں داخل ہو چکی ہوں گی۔ اس طرح ہم بدستور پیچھے رہیں گے اور ہمارا اصل مسئلہ اس کے بعد بھی غیر حل شدہ پڑا رہے گا۔

آج مسلمان جس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اور سیاسی، اقتصادی، صنعتی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر جو تحدیات ان کو درپیش ہیں، وہ کوئی نئی صورت حال نہیں ہے۔ اس قسم کے حالات کا تجربہ امتِ مسلمہ کی طویل تاریخ میں بار بار مختلف شکلوں میں پیش آتا رہا ہے۔ تاریخ مزید بتاتی ہے کہ ہر خطرہ یا ہر چیلنج سے گزرنے کے بعد امت پہلے سے زیادہ طاقت ور اور مستحکم ہو گئی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے امت کو جب اس قسم کے مسائل اور تحدیات سے دوچار ہونا پڑا تو کیا صورت پیش آئی اور کس طرح اس کا مقابلہ کیا گیا۔ اس کا جواب تاریخ کی روشنی میں صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ یہ کامیابی اسلام کی دعوتی طاقت کے ذریعہ حاصل کی گئی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں تاتاریوں نے عالم اسلام کو غیر معمولی نقصان پہنچایا۔ وحشی اور خوں خوار تاتاریوں کی طاقت بظاہر ناقابل شکست بنی ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد اسلام کی دعوتی طاقت ظاہر ہوئی۔ اس نے تاتاری قوم کو مسخر کر لیا۔ ایک مستشرق نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے:

The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. (p. 488)

آج مسلمانوں کو اسلام کی اسی دعوتی طاقت کو لے کر اٹھنا ہے۔ اگر وہ دعوت الی اللہ کے کام کو صحیح طور پر انجام دے سکیں تو یقینی طور پر ان کے حالات بدل جائیں گے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جس کی خبر قرآن میں دی گئی ہے کہ جو لوگ بظاہر ہمارے دشمن نظر آتے ہیں وہ ہمارے دوست اور ساتھی بن جائیں گے (۴۱ : ۳۴)

موجودہ زمانہ میں اسلام کے دعوتی عمل کو زندہ کرنے کے مواقع غیر معمولی حد تک بڑھ گئے ہیں۔ ایک طرف یہ ہوا ہے کہ مذاہب کے علمی مطالعہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ کسی بھی دوسرے مذہب کو تاریخی اعتباریت حاصل نہیں۔ جبکہ اسلام ہر علمی جانچ میں معتبر ثابت ہوا ہے۔ اس طرح گویا اسلام اس حیثیت میں ہے کہ وہ بلامقابلہ کامیابی حاصل کر سکے۔

جہاں تک انسانی ساخت کے ازموں کا تعلق ہے ، وہ بھی سب کے سب ناکام ہو چکے ہیں ، اس سلسلہ کا آخری فیصلہ کن واقعہ کمیونسٹ ایمپائر کا ٹوٹنا ہے ۔ کمیونسٹ ایمپائر کی موجودگی میں دنیا اس غلط فہمی میں تھی کہ ہمارے پاس ایک آئیڈیا لوجی موجود ہے ۔ مگر ۱۹۹۱ میں جب کمیونسٹ ایمپائر ٹوٹ کر گر گئی تو اس بھرم کا بھی خاتمہ ہو گیا اب ساری دنیا میں ایک فکری اور نظریاتی خلا (ideological vacuum) ہے ۔ اس خلا کو صرف اسلام پُر کر سکتا ہے ۔

اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ مسلمان اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کے ذریعہ سے اقوام کی فکری تسخیر کر کے اسلام کی نئی تاریخ بنائیں ۔

اب ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود اپنی تاریخ کے اس تجربہ کو نئے حالات میں دہرائیں جو بار بار اپنی کامیابی کو ثابت کر چکا ہے ۔ یعنی ہم موجودہ مسائل اور تحدیات کا مقابلہ اسلام کی دعوتی طاقت کے ذریعہ کریں ۔ مسلمان اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ دعوت کی طاقت سے فتح یاب ہوئے ہیں ، اور آج بھی یقینی طور پر اسی کے ذریعہ وہ فتح یاب ہو سکتے ہیں ۔

دعوت کی تسخیریت کا راز اس کی نفع بخشی کی صفت ہے ۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے لیے نافع ہو ، اس کو لوگوں کے درمیان قبولیت اور جماؤ ملے ۔ اسلام سب سے بڑی نفع بخش چیز ہے ——— وہ انسان کی تلاش حق کا جواب ہے ، وہ انسان کو سچا نظریۂ حیات دیتا ہے ۔ وہ انسان کو ذہنی سکون عطا کرتا ہے ، وہ انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے ۔ وہ انسان کو اس شاہراہ کی دریافت کراتا ہے جس پر چل کر وہ دنیا سے لے کر آخرت تک محفوظ سفر طے کر سکے ۔

بلاشبہہ اس سے زیادہ نفع بخش اور کوئی چیز انسان کے لیے نہیں ۔ اس لیے اس سے زیادہ قابل قبول چیز بھی انسان کے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی ۔

اسلام کا یہ تسخیری پہلو ایک معلوم اور مشہور حقیقت ہے ۔ اگر آپ کے پاس زیادہ تحقیقی مطالعہ کا موقع نہ ہو تو آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ ریاض سے نکلنے والے عربی ہفت روزہ الدعوہ کو یا مکہ سے نکلنے والے اخبار العالم الاسلامی کو پڑھ لیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے تقریباً ہر شمارہ میں اسلام کی دعوتی تسخیر کی خبریں موجود ہیں ۔

مثال کے طور پر اسی مہینہ میں الدعوہ (ریاض) کے شمارہ ۱۲ اگست ۱۹۹۳ میں ایک خبر اس سرخی کے ساتھ چھپی ہوئی ہے کہ ۹۰۰ شخص یعتنقون الاسلام۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے چند مہینے میں جنوبی افریقہ میں تقریباً نوسو آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان میں سے چار مسیحی پادری ہیں۔

اسی طرح اسی مہینہ میں العالم الاسلامی (مکہ) کے شمارہ ۱۶-۲۲ اگست ۱۹۹۳ کے انگریزی حصہ میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کی سرخی یہ ہے :

653 embrace Islam in UAE

اس سرخی کے تحت چھپنے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۱۴۱۳ھ کے ایک سال کے دوران صرف عرب امارات میں بیرونی ملکوں کے جو لوگ دین اسلام میں داخل ہوئے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۶۵۳ ہے۔

یہ دونوں خبریں صرف بطور مثال نقل کی گئی ہیں۔ ورنہ اس طرح کے دعوتی واقعات ہر روز دنیا کے ہر حصہ میں تقریباً تسلسل کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔

اسلامی دعوت کی اہمیت نظری طور پر بھی مسلّم ہے اور عملی تجربہ میں بھی اس کی افادیت پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ دعوت کو باقاعدہ ملّی پروگرام قرار دے کر اس کے لیے منظم اور منصوبہ بند عمل شروع کر دیا جائے۔

دعوتی طریق کار کی کامیابی جزئی طور پر آج بھی ظاہر ہو رہی ہے، جب کہ ابھی دعوت کا کام منظم طور پر اور قومی فیصلہ کے تحت انجام نہیں دیا جارہا ہے۔ پچھلے سو سال میں بے شمار سیاسی قربانیاں دی گئی ہیں۔ مگر اس سے ابھی تک کوئی حقیقی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ جب کہ اسی مدت میں دعوت نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کر کے انھیں اسلام کے دائرہ میں داخل کیا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ واحد غیر محرف مذہب ہے۔ ہر قسم کی علمی صداقتیں اس کے حق میں جمع ہو چکی ہیں۔ ان چیزوں نے اسلام کو اپنی ذات میں ایک موثر طاقت بنا دیا ہے۔ چنانچہ ہر ملک میں اور دنیا کے ہر علاقہ میں لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔

آخری بات

قرآن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے مسائل ومشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ وہ ان قوموں کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام کریں جن کی طرف سے یہ مسائل اور مشکلات پیش

آرہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ تحدیات اقوام کا مقابلہ کرنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر دعوت اقوام ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی حسب ذیل آیت ایک فیصلہ کن رہنما کی حیثیت رکھتی ہے :

يَا اَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ، وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه، وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ ٦٧)	اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا، اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ امت محمدی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ جب وہ قوموں کے اوپر دعوت کا کام کرے تو وہ ان کے مظالم سے پوری طرح محفوظ رہے۔

جب قرآن میں یہ واضح رہنمائی موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ عصر حاضر کے مسلمان مشکلات و مسائل کا شکار ہونے کے باوجود، دعوت الی اللہ کی منصوص تدبیر کے لیے متحرک نہ ہو سکے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے صبر نہ کر سکنا۔ صبر دعوت الی اللہ کی واحد لازمی قیمت ہے۔ جو لوگ صبر کی قیمت ادا نہ کر سکیں وہ دعوت الی اللہ کا کام بھی نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجئے :

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (ابراهيم ١٢)	اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے اس پر ہم صبر ہی کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

یہ بات پیغمبروں نے اپنی مخاطب قوموں سے اس وقت کہی جب کی ان کی قوم ان کی مخالف ہوگئی اور ان پر زیادتیاں کرنے لگی۔ یہ زیادتی اور اذیت دیگر اقوام کی طرف سے ہمیشہ داعیٔ حق کو پیش آتی ہے۔ مگر داعی کو ان تمام زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کی مثبت نفسیات بھنگ نہ ہونے پائے، تاکہ وہ مخاطبین کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے ان کے اوپر دعوت کے عمل کو جاری رکھے۔

اس آیت میں توکل سے مراد اللہ کے اس بتائے ہوئے طریقہ پر یقین کرنا ہے۔ یعنی داعی پوری طرح اس بات پر متوکل ہو جائے کہ وہ مخاطبین کے ظلم کے خلاف براہ راست کوئی کارروائی نہ کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا جو کام ان کے اوپر انجام دے گا۔ وہ پیغام الٰہی کی پیغام رسانی کے ساتھ اس کے قومی مسائل کا بھی یقینی حل بن جائے گا۔

آج اہل اسلام کو اسی توکل علی اللہ کا ثبوت دینا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں اس توکل کا ثبوت دے دیں تو اس کے بعد ان کے تمام مسائل اس طرح حل ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

یہ مقالہ الملتقی الاسلامی الاول لدول آسیا (کولمبو) میں ۲۷ اگست ۱۹۹۲ کو پڑھا گیا۔ یہ کانفرنس سعودی عرب کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ کے تحت کی گئی۔

ایک امکان

انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی) نے اپنے شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۲ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر مرلی منوہر جوشی کا انٹرویو چھاپا تھا۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کو ہندو بتایا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مسٹر ایس ایس نیگی (دہرہ دون) نے انڈیا ٹوڈے (۲۹ فروری ۱۹۹۲) میں لکھا ہے کہ مسٹر جوشی کہتے ہیں مسلمان ہندو ہیں کیوں کہ وہ ہندستان میں رہتے ہیں۔ اور انڈین ہندوؤں کے لیے انگریزی لفظ ہے۔ لیکن اگر ہندو کا لفظ قومیت سے تعلق رکھتا ہے تو آخر اس کو مذہب کیوں کہا جائے :

Murli Manohar Joshi says that Muslims are Hindus because they live in Hindustan. And Indian is the English word for Hindus. But then if the word Hindu refers to a nationality, why call it a religion at all? (S S. Negi)

یہ جواب نہایت صحیح ہے۔ نیز یہ کہ یہ فرقہ پرست ہندو کی بات کا جواب خود ہندو کی طرف سے ہے اس لیے اس میں جو تاثیر ہے وہ کسی مسلمان کے جواب میں نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں میں وہ لوگ بہت چھوٹی اقلیت ہیں جو فرقہ پرستانہ انداز کی باتیں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ اور اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے اس کے لیے قربانی دی وہ اکشے برہم چاری تھے۔ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ نے کثرت سے اس موضوع پر منصفانہ مضامین لکھے۔ انڈین ہسٹری کانگرس کے پروفیسروں نے تقریباً متفقہ طور پر اس معاملہ میں فرقہ پرستوں کی مذمت کی۔ ہندوؤں نے ایک سے زیادہ بار "اجودھیا مارچ" کیا۔ اس سلسلہ کا آخری مارچ وہ تھا جو ۳۰ مارچ ۱۹۹۲ کو مسٹر ملائم سنگھ کی قیادت میں ایک ہزار ہندوؤں نے کیا۔ اگرچہ رام سینی گھاٹ پر لاٹھی چارج کر کے انھیں روک دیا گیا (ہندستان ٹائمس ۳۱ مارچ ۱۹۹۲) وغیرہ۔

مسلمانوں کے نااہل لیڈر اکثر اس طرح کے مواقع پر غلط اقدام کر کے معاملہ کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اگر یہ مسلم لیڈر چپ رہیں تو خود ہندوؤں میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو ان مسائل میں زیادہ بہتر طور پر ہمارا بدل بن جائیں۔

ایک سفر

ستمبر ۱۹۹۲ میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے درمیان ایک طویل سفر ہوا۔ اس سفر کے دوران مختلف قسم کے تجربات ہوئے۔ اس کی روداد اختصار کے ساتھ یہاں لکھی جاتی ہے۔

۱۱ ستمبر کی رات کو گیارہ بجے کے بعد گھر سے دہلی ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں خوشگوار ہواؤں کے جھونکے استقبال کرتے ہوئے ملے۔ خیال آیا کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو سانس لینے کے لئے ہر لمحہ تازہ آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ کیا کہ آکسیجن کی مسلسل فراہمی کا انتظام فرما دیا۔ زمین کی سطح پر آدمی جہاں بھی جائے اس کے لئے زندگی بخش ہوا (آکسیجن) پیشگی طور پر موجود ہوگی۔ یہ انتظام اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک بامعنی منصوبہ بندی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو طلب اور رسد میں یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

میں ایرپورٹ کی انتظارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قریب کی سیٹ پر ایک کافی بوڑھی خاتون بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں آیا کہ یہ معذور خاتون ایرپورٹ کی لمبی مسافت طے کر کے کس طرح ہوائی جہاز تک پہنچے گی۔ اتنے میں ایرپورٹ کا ایک باوردی آدمی مخصوص پہیہ والی گاڑی (Wheel chair) لے کر وہاں آگیا۔ گاڑی خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ اس نے خاتون کو اس پر بٹھایا اور اس کو چلاتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

ہوائی اڈوں پر ہر جگہ اس قسم کا مفت انتظام ہوتا ہے۔ مسافر کے لئے صرف اطلاع کر دینا کافی ہے۔ اس کے بعد ہوائی اڈہ یا ایرکمپنی کا آدمی گاڑی لے کر آئے گا اور مسافر کو اس پر بیٹھا کر احترام کے ساتھ اس کو جہاز تک پہنچا دے گا۔ معذور آدمی خصوصی توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ آخرت میں بھی معذوروں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا، بشرطیکہ وہ اللہ کی نظر میں فی الواقع معذور قرار پائیں۔

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ قصہ یاد آیا جو میں نے پاکستان کے اخبار نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۲ میں پڑھا تھا۔

پاکستان کے حکیم محمد سعید صاحب جون ۱۹۹۲ میں کراچی سے تیونس گئے تھے تاکہ ایک طبی کانفرنس

یں شرکت کرسکیں۔ وہ پاکستانی ایئرویز کے ذریعہ کراچی سے دہلی آئے۔ اور دہلی سے الیتالیہ کے ذریعہ براستہ روم وہ تیونس گئے۔ حکیم صاحب اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

" اندرا گاندھی ایئرپورٹ پر الاطالیہ سے جب میں نے سوال کیا کہ کیا میرا سامان جو تیونس کے لئے بک ہے، پی آئی اے سے الاطالیہ میں منتقل ہوگیا ہے۔ تو وہ حیران ہوئے، اچھا سامان ہے، مگر پی آئی اے نے تو ہمیں ذرا بھی اطلاع نہ دی۔ ان کا تو اب دفتر بھی بند ہوگیا ہے۔ نہ جانے سامان کہاں ہے۔ میں خود حیران ہوا کہ وہ خاتون جو مجھے وی آئی پی کا مرتبہ دینے آئی تھیں۔ انھوں نے میرے سامان کو لاوارث چھوڑ دیا۔ خاصی پریشانی ہوئی۔ اندرا ایئرپورٹ پولیس کے لوگ کام آئے۔ سب تلاش میں لگ گئے۔ بالآخر سامان مل گیا اور اسے الاطالیہ میں رکھوا دیا گیا اور میں ۱۲ بجے رات اندرا گاندھی ایئرپورٹ کے خوب صورت لاونج میں آکر بیٹھ گیا۔ (نوائے وقت، ۱۰ جولائی ۱۹۹۲)

ایک بار ایک پاکستانی دانشور نے لکھا تھا: "اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہنود بروزن یہود ہیں"۔ پاکستانی اخباروں کو مذکورہ قسم کے واقعات سے سبق لینا چاہئے اور اپنے عوام کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرنا چاہئے۔

رات کو ایک بجے سوئس ایئر کی فلائٹ نمبر ۱۸۱ کے اندر داخل ہوا۔ جدید طریقہ کے مطابق ایئرپورٹ اور جہاز کے درمیان معلق پل (Aerobridge) کا انتظام تھا۔ اس کے ذریعہ آدمی نہایت آسانی کے ساتھ چلتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ مگر مجھ کو ذاتی طور پر قدیم سیڑھی والا طریقہ زیادہ پسند ہے۔ قدیم طریقہ میں ایک رومانی لمس (romantic touch) ہے۔ یہاں قدیم اور جدید میں وہی فرق ہے جو گھوڑے اور موٹر سائیکل میں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہرالڈ ٹریبون (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس میں بہت سی سبق آمیز خبریں نظر سے گزریں۔ اس کے صفحہ ۶ پر پچاس سال کی چھپی ہوئی ایک خبر دوبارہ چھاپی گئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ کو واشنگٹن حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس نے پچاس خاتون پائلٹوں کا انتخاب کیا ہے جو امریکہ میں ہوائی جہاز چلائیں گی۔ اس وقت ایئر ٹرانسپورٹ کمانڈ کے ڈپٹی چیف لفٹننٹ کرنل رابرٹ لو (Robert M. Love) نے پر فخر طور پر کہا تھا کہ اب میں یہ لفظ نہیں بولوں گا کہ ہمارا مین پاور بلکہ یہ کہوں گا کہ مین اینڈ وومن پاور:

I shall not say our man power,
but of our man and woman power.

اس منصوبہ کے مطابق اب امریکہ (اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں مرد پائلٹ اور خاتون پائلٹ کی تعداد برابر ہونی چاہئے۔ مگر ۱۹۴۲ کا یہ اعلان حقیقت سے زیادہ خوش فہمی پر مبنی تھا۔ میں نے بار بار مغربی ملکوں میں سفر کئے ہیں اور تقریباً ہر بڑی ہوائی کمپنی کے جہاز میں بیٹھا ہوں مگر میرے تجربہ میں ایک بار بھی کوئی خاتون پائلٹ نہیں ملی۔ خاتون پائلٹ آج بھی تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔

فطرت کے مطابق اقدام آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے، اور فطرت کے خلاف اقدام صرف بربادی اور ناکامی کی طرف۔

سوئس ایر کا ماہ ستمبر کا فلائٹ میگزین (Swissair gazette) دیکھا۔ اس کے اداریہ میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت تقریباً تمام بڑی بڑی ہوائی کمپنیاں گھاٹے پر چل رہی ہیں۔ آئی اے ٹی اے (IATA) کی ممبر کمپنیوں کے بارہ میں اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۹۲ میں ان کی کل آمدنی ۳۰۰ ملین ڈالر ہو گی جب کہ ان کا مجموعی خرچ چھ بلین ڈالر ہوگا۔ سوئس ایئر بھی خسارہ کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ چنانچہ اس کی موجودہ حکمت عملی ہے —— پیداواری عمل کو بڑھانا اور خرچ کو گھٹانا:

raising productivity and reducing costs

سفر کے دوران جہاز میں اعلان کیا گیا کہ اب ہم جرمنی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ یہ سن کر جرمنی سے متعلق کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔ جرمنی سے ہندستان کے کئی تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک نیتاجی سبھاش چندر بوس کی جرمنی میں آمد ہے۔ وہ ان دنوں کلکتہ میں اپنے گھر کے اندر نظر بند تھے۔ انھوں نے اپنی داڑھی کو شیو کرنا چھوڑ دیا۔ دو مہینہ میں جب داڑھی بڑھ گئی تو انھوں نے مولوی کا بھیس بدلا اور کلکتہ سے بذریعہ ٹرین پشاور پہنچے۔ اور وہاں سے کابل گئے۔ اس کے بعد لمبا سفر طے کرتے ہوئے ۳ اپریل ۱۹۴۱ کو برلن پہنچ گئے۔

سبھاش چندر بوس چانکیہ کے اس اصول پر یقین رکھتے تھے کہ "دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔" چنانچہ وہ برطانیہ کے دشمن اڈولف ہٹلر سے برلن میں ملے۔ ہٹلر کھلم کھلا مدد کرنے پر راضی نہ ہوا۔ البتہ اس نے مخفی طور پر ان کے لئے کئی مدد فراہم کی۔ انھوں نے برلن میں فری انڈیا سنٹر قائم کیا۔

اسی کے ساتھ انھوں نے جاپان سے ربط قائم کیا۔ جاپانیوں نے دوسری عالمی جنگ کی ابتدا میں جب پینانگ پر قبضہ کیا تو برطانی فوج کے بہت سے ہندستانی سپاہی گرفتار ہو کر جاپان لے جائے گئے۔ سبھاش چندر بوس کی درخواست پر جاپان نے ان ہندستانی سپاہیوں کو رہا کر کے انھیں سبھاش چندر بوس کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے دوسرے ہندستانی افراد کو ملا کر آزاد ہند فوج بنالی۔ اس تربیت یافتہ فوج کے تین ڈویژن تھے۔ ان میں سے ہر ڈویژن میں ۱۰ ہزار مسلح سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ ۲۰ ہزار والنٹیر تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ میں سبھاش چندر بوس نے انڈپنڈنٹ انڈین گورنمنٹ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ رنگون کے راستہ سے ہندستان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں ان کا مقابلہ برطانی فوج سے ہوا۔ برطانی فوج کے پاس ہوائی جہاز تھے۔ مگر سبھاش چندر بوس کی فوج کسی ہوائی حمایت (aerial support) سے خالی تھی۔ چنانچہ اس کو شکست ہوئی۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۵ کو سبھاش چندر بوس ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گئے۔

سبھاش چندر بوس نے برٹش راج کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کا منصوبہ بنایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے خون دو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو آزادی دوں گا:

Give me blood and I promise you freedom.

ہزاروں آدمی سبھاش چندر بوس کی اس پکار سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنا خون پیش کر دیا۔ مگر مسٹر بوس سمیت ہزاروں آدمیوں کا خون کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ دوسری طرف مسٹر بوس مہاتما گاندھی کے سخت خلاف تھے۔ وہ گاندھی جی اور ان کے غیر تشددانہ اور مصالحانہ انداز (conciliatory attitude) کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو مہاتما گاندھی آزادی کا انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور سبھاش چندر بوس ناکام رہے۔

جرمنی میں ہم جنسی کے تعلقات کا رواج ہے۔ مگر اس قسم کے تعلق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں جیسا کہ مثلاً ڈنمارک اور نیوزی لینڈ میں ساتھ رہنے کے معاہدہ (cohabitation contract) کے نام پر موجود ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں جرمنی کے تقریباً پچاس شہروں میں جرمن مردوں اور عورتوں کے ایک طبقہ نے مظاہرہ کیا۔ وہ سڑکوں پر گھومے اور یہ مانگ کی کہ ہم جنس کی شادی

کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ یہ جوڑے اسی طرح ایک دوسرے (same-sex marriage) کے وارث ہوں جس طرح عام منکوحہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے ایک جرمن مسافر سے کچھ سوالات کئے۔ میری عادت ہے کہ اکثر میں سوالات کی صورت میں گفتگو کرتا ہوں۔ اس نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہ نامساوی قوانین جو کہ اس وقت ہمارے یہاں ہیں ان کا خاتمہ کر دینا چاہئے:

I think these unequal laws that we now have must be knocked down.

اس نے اپنا نام ایڈتھ ماریا اسٹال (Edith Maria Stoll) بتایا۔ میں نے کہا کہ نکاح کے موجودہ قوانین اَن ایکول نہیں ہیں بلکہ وہ نیچرل ہیں۔ یہ ایکول اور اَن ایکول کا مسئلہ نہیں، بلکہ نیچرل اور اَن نیچرل کا مسئلہ ہے۔

ہوائی جہاز کی چھت میں جگہ جگہ ویڈیو لگا ہوا تھا۔ اس پر جہاز سے متعلق معلومات تصویر کی صورت میں دکھائی جا رہی تھیں۔ دنیا کا نقشہ بنا کر اس پر ایک لال لکیر رینگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو بتا رہی تھی کہ اب جہاز کہاں پہنچا اور کس طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بتایا جا رہا تھا کہ اب جہاز اپنی منزل سے کتنی دور ہے۔ آخری مرحلہ میں گنتی بتا رہی تھی کہ اب جہاز ۶۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۵۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ اس طرح کم ہوتے ہوتے گنتی آخر میں پہنچ گئی اور جہاز اپنی منزل پر اتر گیا۔

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ انسان کی ذات کا بھی ہے۔ جوانی کی عمر تک زندگی اوپر کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے۔ بال میں سفیدی ظاہر ہو کر بتاتی ہے کہ اب دور زوال شروع ہو گیا۔ اسی طرح آنکھ، دانت اور دوسرے تمام اعضا کمزور ہونے لگتے ہیں۔ جسم کا ایک ایک حصہ آدمی کا ساتھ چھوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر وقت آ جاتا ہے۔ موت سے پہلے ظاہر ہونے والے قدرت کے نشانات کو آدمی اگر پڑھ سکے تو موت کے امتحان میں پورا اترنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔

جہاز ۳۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا آٹھ گھنٹہ میں دہلی سے زیورک پہنچ گیا۔ میں نے

۱۱ ستمبر کو عشاء کی نماز نظام الدین (دہلی) کی قریش مسجد میں پڑھی تھی۔ ۱۲ ستمبر کو فجر کی نماز میں نے زیورک (سوئزرلینڈ) میں پڑھی۔ جب کہ دونوں مقامات کے درمیان تقریباً ۶۲۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

زیورک میں جہاز کی لینڈنگ بہت سہل تھی۔ جہاز نہایت سہولت سے رن وے پر اتر کر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت میں ہیرالڈ ٹریبون (۱۲ ستمبر) میں امریکہ کی اقتصادی حالت کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے اور آئندہ اس کو اس سے بھی زیادہ سخت اقتصادی مسائل کا سامنا ہے۔ اس رپورٹ کی سرخی یہ تھی:

(Hard landing ahead)

اس کو پڑھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ دنیا میں تو ماہر پائلٹ اور موسم کی موافقت کی بنا پر "سہل لینڈنگ" میرے حصہ میں آئی ہے آخرت میں اگر "ہارڈ لینڈنگ" ہو تو وہاں کیا چیز ہوگی جو مجھے بچانے والی ثابت ہو۔

پائلٹ سے میں نے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے حد ٹکنکل بات ہے۔ تاہم آسان لفظوں میں میں کہوں گا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ بلکہ نیچر اڑاتی ہے۔ ہوائی جہاز کی چڑیا جیسی شیپ، اس کا پنکھا، ہوا کو آگے سے کھینچ کر پیچھے پھینکنا، اس قسم کے کچھ اسباب کو ہم جمع کرتے ہیں۔ اس کے بعد جہاز اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ اور پھر انجن کی حرکت سے آگے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ اس کی سادہ مثال ایسی ہے جیسے غبارہ بغیر ہوا تو وہ زمین پر پڑا رہے گا۔ لیکن اگر آپ اس میں ہوا بھر دیں تو وہ اپنے آپ ہوا میں اوپر اٹھ جاتا ہے۔

زیورک میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اتفاق سے اردو جانتا تھا۔ ایران اور افغانستان وغیرہ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ اس وقت مسلمان ہر طرف محرومی کا شکار ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے دشمن ہر جگہ ان کے حقوق سلب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محرومی کے اس نظریہ نے مسلمانوں سے وہ عظیم چیز چھین لی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر ان کو عطا کی تھی۔ اور وہ ہے دعوت کی طاقت اور داعیانہ منصب۔ داعی کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے جس کو وہ دوسروں کو دے

سکتے ہیں۔ مگر محرومی کے نظریہ نے ان سے یہ دولت چھین لی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ محرومی کے احساس میں مبتلا ہوں وہ کبھی یافت کا پیغام دینے والے نہیں بن سکتے۔

زیورک سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاز میں ویڈیو پر اس کے جو مناظر دکھائے گئے اس میں وہ خوب صورت شہر کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ تصویر میں یہ دنیا بے حد حسین ہے مگر حقیقت میں وہ ایسی حسین اور پر راحت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا کے ساتھ خوف اور حزن لگا ہوا ہے اس خوف اور حزن نے اس کو ساری معنویت کے باوجود بے معنی بنا دیا ہے۔ آخرت میں جب خوف اور حزن کو اس سے نکال لیا جائے گا تو دنیا اتنی پر لطف ہو جائے گی کہ آدمی ابدی طور پر اس سے محظوظ ہوتا رہے مگر وہ کبھی اس سے سیر نہ ہو۔

سوئزرلینڈ میں (اور اسی طرح تمام یورپ میں) مسافر کو ہر طرح کا تعاون دیا جاتا ہے۔ مثلاً سوئزرلینڈ میں آپ کو ٹرین سے سفر کر کے ایک ایسے شہر میں پہنچنا ہے جہاں سے آپ کو ہوائی جہاز پکڑنا ہے تو آپ آغاز ہی میں اپنے سامان کو ریلوے کے عملہ کو دیدیجئے۔ آپ کا سامان ٹرین سے اتار کر ہوائی جہاز میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح آپ کی منزل پر آپ کو مل جائے گا۔

زیورک میں اگلے جہاز کے لئے ایک گھنٹہ قیام کرنا پڑا۔ زیورک کا ایرپورٹ بہت بڑا ہونے کے ساتھ بہت عمدہ اور منظم تھا۔ ایک مقام پر دیوار کے اوپر چمکدار حرفوں میں لکھا ہوا نظر آیا:

...your efficiency is our business.

(آپ کی ایفیشنسی ہمارا بزنس ہے) یہ چیز عملاً بھی یہاں ہر طرف نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ انڈیا کے لوگ بھی اگرچہ اس قسم کے الفاظ بولتے ہیں مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے کہا جائے تو انڈیا کا ماٹو شاید یہ ہوگا:

to exploit you is our business

زیورک (Zurich) سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے۔ یہاں دور تاریخ سے پہلے انسانی آبادی قائم ہو چکی تھی۔ ۵۸ ق م میں رومیوں نے اس علاقہ کو فتح کیا۔ اس کا موجودہ نام انھیں کا دیا ہوا ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں یہاں تین مسیحی مبلغوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی مقام پر آج یہاں کا کیتھڈرل بنا ہوا ہے۔ رومی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہاں فرانس کے مسیحیوں کی سلطنت قائم

ہوئی۔ اسی زمانہ میں شارلی مین (Charlemagne) نے موجودہ کیتھڈرل تعمیر کرایا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ہارون الرشید بغداد کا خلیفہ تھا۔

زیورک کا ایئرپورٹ سوئزرلینڈ کا سب سے زیادہ مصروف ایئرپورٹ ہے۔ یہاں سے ستر ملکوں کے ۱۱۰ شہروں کے لئے ڈائرکٹ فلائٹ حاصل کی جاسکتی ہے۔ اتصالات کے یہ کیسے عجیب مواقع ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہر طرف کھل گئے ہیں اور حق کے داعیوں کو خاموش زبان میں پکار رہے ہیں کہ آؤ، ان نئے مواقع کو استعمال کرو اور خدا کا کلمہ خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دو۔

زیورک ایئرپورٹ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر آجکل وہ جرمنی میں مقیم ہیں۔ وہ اس کانفرنس میں شریک تھے جو جرمنی کی وشو ہندو پریشد کی طرف سے اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں فرینکفرٹ کی گوئٹے یونیورسٹی میں منعقد کی گئی۔ واضح ہو کہ گوئٹے (J.W.V. Goethe) نے کالی داس کا جرمن ترجمہ پڑھا تھا اور وہ اس کے خیالات سے متاثر تھا (10/376) اس کانفرنس کی تھیم تھی ـــــ ہندوازم جدید دنیا میں :

Hinduism in the modern world

مذکورہ ہندو پروفیسر نے کہا کہ ہندوازم کا خلاصہ وحدت انسانیت (One world family) اور عدم تشدد (Non-violence) ہے مگر یہ تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ وہ مذہب جس میں اتنی وسعت ہے کہ وہ منکرین مذہب تک کو اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے، وہ اس وقت تعصب کے الزام کے مقابلہ میں اپنے دفاع پر مجبور ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندو مذہب کے بارہ میں جو غلط باتیں پھیلائی جارہی ہیں ان کا دفعیہ کریں، ورنہ بالآخر وہ ہندستان کی تصویر بگاڑنے والی ثابت ہوں گی:

We want to counter the disinformation now spreading regarding the Hindu religion; otherwise it will ultimately affect the image of India.

میں نے کہا کہ اگر آپ ہندوازم کی تصویر کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہئے کہ اس عمل کو بدلیں جو انڈیا میں وشو ہندو پریشد انجام دے رہی ہے۔ اس قسم کی تقریری کانفرنسوں سے تصویر درست ہونے والی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ خود مسلمان بھی ٹھیک اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ موجودہ زمانہ میں وہ بےصبر ہوکر جگہ جگہ متشددانہ عمل کر رہے ہیں اور جب دنیا یہ کہنے لگتی ہے کہ اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے تو فوراً وہ کانفرنس کرکے اعلان کرتے ہیں کہ یہ ڈس انفارمیشن ہے۔ ورنہ ہم تو جس مذہب پر ہیں وہ امن وسلامتی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہوا میں پرواز کرنے کا تخیل انسان کے اندر کب پیدا ہوا۔ اس کی کوئی قطعی تاریخ معلوم نہیں۔ تاہم تقریباً یقینی طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پرواز کا پہلا خیال انسان کے اندر اس وقت آیا جب اس نے چڑیا کو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے دیکھا۔

غالباً مچھلی کو دیکھ کر انسان کے اندر پانی میں تیرنے کا خیال آیا اور چڑیوں کو دیکھ کر فضا میں اُڑنے کا۔ انسان نے جلد ہی کشتی بنا کر پانی میں تیرنا شروع کر دیا۔ مگر فضا میں اڑنے کا تخیل بہت دیر میں واقعہ بن سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ کشتی بنانے کا کام قدیم دستکاری کے دور میں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر ہوائی جہاز بنانا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ اس سے پہلے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا ہو۔

دوسری کئی چیزوں کی طرح، ہوائی جہاز کو ترقی دینے میں جنگجویانہ ذہن کا بڑا حصہ ہے۔ فرانس کا لوئی چہاردہم (Louis XIV) ایک جنگجو بادشاہ تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سواری بنائی جاسکتی ہے جو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو اس نے اس کام کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۶۶۰ میں اس نے اس کام کے لئے کچھ لوگوں کو ہر قسم کے وسائل دئے۔ تاہم ابتدائی نوعیت کی مشینی سواری (Powered flight) غالباً ۱۸۶۸ میں سومرسیٹ میں بنائی جاسکی۔ جہازوں کے ماڈل کو دیکھا جائے تو ان میں ایک تدریجی ارتقار نظر آئے گا۔

۱۲ ستمبر کی صبح کو سوئس ایر کی فلائٹ کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم بروسیلز میں اتر گئے۔ یہاں کانفرنس کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا قافلہ شہر کے لئے روانہ ہوا۔ بروسیلز کی سڑکیں بہت صاف ستھری نظر آئیں۔ مکانات اور دکانیں بھی نہایت آراستہ تھے۔ ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ اور خوشگوار موسم مزید اس میں اضافہ کر رہا تھا۔

بروسیلز میں میرا قیام بیلسن ہوٹل (Belson Hotel) کے کمرہ نمبر ۱۳۶ میں تھا۔ یہ شہر

کے کنارے خوشنما مقام پر واقع ہے۔ ایک بار میں لفٹ میں تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی۔ لفٹ رک گئی۔ اس کے اندر مکمل اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یاد تھا کہ اس کے اندر ٹیلیفون ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ تھا کہ اس سے پیغام دینے کے لئے کسی نمبر کو ڈائل کرنا ہوگا اور تاریکی کی وجہ سے نمبر کو دیکھنا اور اس کو ڈائل کرنا ممکن نہیں۔ اسی حیص بیص میں رسیور اٹھایا تو اپنے آپ گھنٹی بجنے لگی۔

لفٹ کے ٹیلیفون پر نمبر ڈائل کئے بغیر صرف رسیور اٹھانے سے گھنٹی بجتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو لفٹ کے اندر اندھیرا ہو جانے کے بعد ٹیلیفون کو استعمال کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس کے بعد ہنگامی موقع پر اس ٹیلیفون کو صرف وہ شخص استعمال کرسکتا ہے جس کے پاس ٹارچ موجود ہو۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیش بندی کس چیز کا نام ہے۔ پیش بندی کسی بھی عمل کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

۱۲ ستمبر کی شام کو لووین کی کیتھولک یونیورسٹی (Catholic University of Louvain) میں شرکا ر کانفرنس کی اجتماعی ملاقات اور کھانا تھا۔ یہ یونیورسٹی چودھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس میں ۲۵ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی کا بہت بڑا شعبہ ہے۔ اس کے تحت اسلامک اسٹڈیز کا بھی انتظام ہے۔ یہ یونیورسٹی قدیم طرز کی نہایت عظیم عمارات میں واقع ہے۔

چودھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ میں علم کا چرچا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ یہ زیادہ تر بغداد اور اسپین کے زیر اثر تھا۔ مگر بعد کے دور میں، بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑی شخصیتوں کے باوجود، مسلم دنیا میں علم کا چرچا باقی نہ رہا۔ علم کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا، مگر اس کی تکمیل کے دور میں سارا کریڈٹ مغربی قوموں نے حاصل کرلیا۔ یہی علمی پس ماندگی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے نہ کہ فرضی سازشیں جس کا اعلان غلط طور پر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ہر صبح و شام کرتے رہتے ہیں۔

یونیورسٹی دیکھنے کے بعد ہوٹل واپس آیا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ عین اس وقت کمرہ کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو ایک عرب نوجوان قاہرہ سے بول رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انھوں نے برسیلز میں ہمارے ٹیلیفون کا نمبر کیسے حاصل کرلیا۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دہلی، لندن اور برسیلز میں

کئی ٹیلی فون کیے۔ آخر کار ان کو معلوم ہو گیا کہ میں بروسیلز کے بیلسن ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۳۲ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت لندن میں اور دوبارہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت قاہرہ میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے میں اپنا ٹکٹ ری روٹ کرا کر واپسی میں لندن اور قاہرہ ہوتے ہوئے دہلی واپس جاؤں۔

اس واقعہ کے بعد مجھے فارسی کا مثل یاد آگیا کہ ڈھونڈنے والا پاتا ہے (جوینده یابنده) انسانی دماغ کی یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر وہ قیامت کے یوم الحساب میں مسئول قرار پاتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حقیقی طور پر جس چیز کا طالب ہو اس کو وہ جان سکے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص موجودہ دنیا میں زندگی گزارتا ہے مگر وہ حق سے بے خبر رہتا ہے تو یہ لازمی طور پر اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ اور جو شخص کوتاہی کرے وہ اس عالم اسباب میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

مجھے ٹیلی ویژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے کمرہ کے ٹی وی سیٹ کو استعمال کرنے کا خیال بھی مجھے نہیں آتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سرہانے کی چھوٹی میز پر ریموٹ کنٹرول کا سگرٹ پیکٹ جیسا آلہ رکھا ہوا تھا۔ اس کا سوئچ اتفاق سے دب گیا۔ اس کے بعد ٹی وی سیٹ کے شیشہ پہ نہایت عمدہ رنگین تصویریں آنے لگیں۔ دیکھا تو سمندری زندگی اور جنگل کی زندگی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ فطرت کا یہ منظر حیران کن حد تک عجیب تھا۔ محویت کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اس کو دیکھ کر یہ آیت زبان پر آگئی: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

قرآن میں فطرت کے مشاہدہ اور آیات کون پر غور و فکر کے لئے بہت زور دیا گیا ہے۔ اور اس کے علم کو خشیت الٰہی کا ذریعہ بتایا گیا ہے (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) اس سے معلوم ہوا کہ معرفت الٰہی کا اصل ذریعہ کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے لووین کا فاصلہ ۳۰ کیلومیٹر ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو جب میں اپنے ساتھی کے ہمراہ کار میں وہاں کی تقریب میں شرکت کے لئے جا رہا تھا تو سارے راستہ میں صنعتی ترقی کے مناظر دکھائی دئے سڑکوں سے لے کر عمارتوں تک ہر چیز واضح طور سے ہندستان سے مختلف نظر آئی۔

یہی تمام مغربی ملکوں کا حال ہے۔ میں نے سوچا کہ مغرب کے وسائل سے زیادہ وسائل ہندستان

کے پاس موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندستان اب تک ایک غیر ترقی یافتہ ملک بنا ہوا ہے۔ اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ ہندستان کا مذہب لکشمی پوجا ہے اور مغرب کا مذہب جیون پوجا۔ ہندستانی آدمی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جیسے بھی ہو زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے۔ اس کے مقابلہ میں مغربی انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے زندگی کو بہتر بنائے۔ ہندستانی آدمی زر اندوزی کو سب کچھ سمجھتا ہے جب کہ مغرب کے آدمی کے لئے سب کچھ یہ ہے کہ وہ حیات مادی کی تعمیر کرے ــــــ سوچ کا یہی فرق ہے جس نے دونوں دنیاؤں میں وہ فرق پیدا کر دیا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

۱۳ ستمبر کو ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر لیونارڈو شہر دکھانے کے لئے گئے۔ ڈاکٹر ثانی اثنین بھی میرے ساتھ تھے۔ شہر کا کچھ حصہ کار پر بیٹھ کر دیکھا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر لیونارڈو سے کہا کہ شہر کو زیادہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے پیدل چلنا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو گاڑی کسی مقام پہ پارک کر دیں اور ہم لوگ پیدل چل کر شہر کو دیکھیں۔ انھوں نے اتفاق کیا۔ چنانچہ گاڑی مسجد کے پاس پارک کر دی گئی اور ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے چل پڑے۔

بروسیلز نہایت منظم اور نہایت خوب صورت شہر ہے۔ سڑکیں نہایت عمدہ اور صاف ستھری ہیں۔ کہیں ٹوٹ پھوٹ کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ چاروں طرف گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ مگر نہ ہارن کی آواز تھی اور نہ دھواں۔ خوب صورت فوٹ پاتھ ہیں مگر خوانچہ فروشوں کا کہیں وجود نہیں۔ پارک ہیں مگر شور وغل نہیں۔ دکانیں ہیں مگر لوٹ نہیں۔ سرگرمیاں ہیں مگر بے قاعدگی نہیں۔ مکانات ہیں مگر غیر قانونی تعمیرات نہیں۔ سارا شہر ایک ڈھلا ہوا ماڈل نظر آتا ہے۔

ایک سڑک پر چلتے ہوئے ایک بہت بڑی عمارت نظر آئی۔ سیکڑوں لوگ اندر داخل ہونے کے لئے لمبی قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے گیٹ پر مقامی تلفظ میں لکھا ہوا تھا پارلی منٹ (Parlement) سامنے بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے اوپر بارہ ستارے بنے ہوئے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ "یورپین پارلی منٹ" ہے۔ متحدہ یورپ کا تصور اس وقت مغربی یورپ میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ میں شریک ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بارہ ستاروں کا جھنڈا اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ ملکی قومیت کے ماننے والے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر اس تحریک نے عملی صورت اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اگر کسی وقت یورپ متحد ہو گیا تو یقینی ہے

کہ امریکہ نمبر ۲ پر چلا جائے گا۔

ایک بار برسلز میں نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہاں میں مشرق کی سمت میں نماز پڑھ رہا ہوں اگر کوئی شخص مجھ کو دیکھ کر کہے کہ ہندستان میں تو آپ مغرب کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے تھے اور بلجیم میں مشرق کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے اپنا قبلہ بدل دیا۔ حالاں کہ اسلام میں جان بوجھ کر اپنا قبلہ بدلنا کفر کے ہم معنی ہے۔

یہ تنقید بظاہر صحیح مگر باعتبار حقیقت غلط ہوگی۔ کیوں کہ مسلمان کا اصل قبلہ مشرق یا مغرب نہیں ہے۔ بلکہ کعبہ ہے۔ ہندستان میں کعبہ چونکہ مغرب کی سمت میں واقع ہے اس لئے وہاں مغرب کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔ بلجیم میں کعبہ مشرق کے رخ پر ہو جاتا ہے اس لئے یہاں مشرق کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۳ اگست ۱۹۹۲) میں میں نے بلجیم کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ یہ بلجیم کے ایک سیاح سمٹ رونی سے نوائے وقت کے نمائندہ طاہر ملک کی گفتگو پر مشتمل تھی۔ بلجیم کو دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مذکورہ سیاح کی بات تقریباً صدفی صد درست ہے۔ مزید یہ کہ اس نے جو بات پاکستان کے بارہ میں کہی، وہی ہندستان پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

" میں چالیس سے زیادہ ممالک کی سیاحت کر چکا ہوں۔ مگر پولیس کی بہتات پاکستان میں سب سے زیادہ دیکھی ہے۔ یہاں بے شمار چیکنگ پوسٹ ہیں جہاں بلا وجہ شہریوں کو روک کر تلاشی لی جاتی ہے بلجیم میرا ملک ہے۔ وہاں نہ تو مسلح پولیس ہوتی ہے اور نہ ہی عوام کو روک کر جگہ جگہ چیک کیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد میں عام افراد کے ہاتھوں میں سرعام اسلحہ پہلی بار دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا"۔ ان خیالات کا اظہار بلجیم سے پاکستان سیاحت کیلئے آئے سمٹ رونی نے نمائندہ نوائے وقت کے سوال پر کہ آپ کو پاکستان میں سب سے منفرد کیا چیز لگی؟ کا جواب دیتے ہوئے کیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں جرائم اور دہشت گردی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلجیم مکمل طور پر ایک پرامن ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں قانونی طور پر پولیس، فوج اور عام شہریوں سمیت کسی کو آبادی میں سرعام اسلحہ لے کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اپنی بات کی وضاحت

کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کے ملک میں قانون کے مطابق پولیس فوج یالائسنس اسلحہ رکھنے والا کوئی بھی فرد شہری علاقوں میں اسلحہ کی نمائش نہیں کرسکتا۔

فوج کو عام حالات میں آبادی میں یونیفارم میں آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ قانونی طور پر فوج مسلح یونیفارم میں صرف ایمرجنسی کی صورت میں آبادی میں آنے کی مجاز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں فوج کی چھاؤنیاں آبادی سے دور بنائی جاتی ہیں تاکہ عوام کا فوجی چھاؤنی سے گزر بھی نہ ہوسکے۔ جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہاں کی حکومت کے خیال میں آبادی کے علاقے میں قانون نافذ کرنے والے افراد کے پاس اسلحہ سے عام شہری کے خوف زدہ ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس طرح عوام اپنے مقابلہ میں پولیس یا فوج کو برتر خیال کرسکتے ہیں۔ پولیس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ پولیس اسلحہ کے بغیر اپنے فرائض انجام دیتی ہے اور صرف ضرورت کے وقت مسلح نظر آتی ہے۔ پولیس کا عوام سے رویہ نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے۔ جرائم کی روک تھام کے علاوہ پولیس عوام کی ذاتی مشکلات میں امداد بھی کرتی ہے جس کی مثال دیتے ہوئے سمٹ روتی نے کہا کہ اگر کسی شخص کی گاڑی راستے میں خراب ہو جائے تو پولیس خراب گاڑی کو درست کرنے میں مدد کرتی ہے یا اس شخص کو سرکاری سواری میں منزل مقصود تک لے جاتی ہے پاکستان سے موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہاں جگہ جگہ مسلح پولیس والے نظر آتے ہیں جو کہ عوام کے دوست ہونے کی بجائے اتھارٹی کا تاثر دیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ وہ یہاں جب مسلح پولیس والوں کو دیکھتے ہیں تو تحفظ کی بجائے خوف محسوس کرتے ہیں۔ سیاحت کے حوالے سے اخراجات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ان کا کل خرچہ ۵۵ ہزار روپے کے قریب ہوا ہے اور بلجیم میں ان کی تنخواہ ماہانہ ۲۷ ہزار پاکستانی روپے ہے۔ وہ ہر سال بونس ملنے پر چھٹیوں میں آسانی سے غیر ملکی سیاحت کے لئے نکلتے ہیں۔ یوں وہ ہر سال ایک یا دو ملک کی سیاحت کرتے ہوئے پوری دنیا دیکھنے کا خواب پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (صفحہ ۲)

۱۲ ستمبر کو ہم نے بروسیلز کی جامع مسجد دیکھی۔ یہ مسجد شہر کی نہایت اہم سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کا جائے وقوع نہایت شاندار ہے۔ اس کے ایک طرف مصروف سڑک کے کنارے شہر کی پرشوکت تجارتی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف بے حد وسیع پارک ہے۔ اور

اس کی وجہ سے دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ ایک گنبد کی یہ مسجد خود بھی نہایت عظیم اور پُر وقار عمارت کی صورت میں کھڑی ہوئی ہے۔

یہ مسجد رابطة العالم الاسلامی کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ اس کے دروازہ پر المسجد الجامع ببروکسل (Grande Mosque) لکھا ہوا ہے۔ ایک اور بورڈ بتا رہا ہے کہ اسی عمارت میں بلجیم کا اسلامی اور ثقافتی مرکز (المرکز الاسلامی والثقافی ببلجیکا) بھی قائم ہے۔ مسجد کے ساتھ وسیع احاطہ بھی موجود ہے۔ ہم یہاں ۱۲ بجے دن میں پہنچے تھے۔ اس وقت مسجد کے دونوں دروازے بند تھے۔ اس لئے ہم مسجد کے اندر داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا نہ کرسکے۔ دروازہ کے نوٹس بورڈ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: المسجد یفتح ابوابہ فی وقت الصلاۃ۔ یعنی مسجد کے دروازے نماز کے وقت کھلتے ہیں۔



اس کے بعد آگے بڑھے تو بروسیلز کا بڑا چرچ (St. Michael's Cathedral)
نظر آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ زائرین کا ہجوم اندر جاتا اور باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ
اگر کوئی شخص بروسیلز کی مسجد اور یہاں کے کیتھڈرل کے اس فرق کو دیکھ کر خود مسیحیت اور
اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرے اور کہے کہ دیکھو، مسیحی مذہب شاندار طور پر زندہ
ہے اور اسلام کی عمارت پر قفل پڑ چکے ہیں تو بظاہر صحیح دکھائی دینے کے باوجود وہ ایک
غلط بات ہوگی۔ کیوں کہ یہ ایک مقامی معاملہ ہے نہ کہ عمومی طور پر پوری دنیا کا معاملہ۔
بروسیلز کا یہ تاریخی کیتھڈرل مکمل طور پر پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کی عمارت
رہیبت حد تک بلند اور عظیم ہے۔ وہاں مفت تقسیم کے لئے ایک پمفلٹ موجود تھا۔
اس سے معلوم ہوا کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس مقام پر ایک بڑا رومن چرچ
(Romanesque church) تھا۔ اس کے کھنڈر پر ہنری اول (Henry I) کے حکم سے
تیرھویں صدی میں ایک بڑا چرچ بنایا گیا۔ اس کے بعد تین سو سال تک اس میں تعمیرات جاری
رہیں۔ شاہ چارلس پنجم (Charles V) کے زمانہ میں موجودہ عظیم عمارت کی تکمیل ہوئی۔ اس
کے ساتھ ایک مذہبی تعلیمی ادارہ بھی ہے۔ یہاں مسیحیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کو چرچ کالج
(collegiate church of SS Michael) کہا جاتا ہے۔
تعمیری عظمت کے اعتبار سے یہ کیتھڈرل یہاں کی مسجد سے بہت زیادہ بڑا ہے۔ مگر کیتھڈرل
کے چاروں طرف صرف عمارتوں کا ماحول ہے۔ جب کہ مسجد کے اردگرد ہرا بھرا ماحول ہے۔
مسجد گویا ایک بہت بڑے پارک کے درمیان کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عرض
کیا گیا، کیتھڈرل کے اندر زبردست سرگرمیاں تھیں لیکن مسجد میں اس وقت کوئی انسانی
سرگرمی نظر نہیں آئی۔ کیتھڈرل کے اندر مختلف قسم کے لٹریچر مسیحیت سے متعلق رکھے ہوئے تھے۔
ان میں سے ایک کو میں نے لے لیا۔
۱۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ یہ بروسیلز سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ
پر لووین (Louxain) کے اسپورٹس سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ یہ سنٹر غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ اس
کے جس ہال میں اجلاس کا انتظام تھا وہ اپنی غیر معمولی تعمیرات سے عجیب پر اثر معلوم ہو رہا تھا۔

وسیع ہال میں دو ہزار سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد اور عورت موجود تھے۔ اس سے متصل ایک کمرہ میں اخباری رپورٹروں کا انتظام تھا۔ یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ وہ خود ایک ہال کی مانند نظر آرہا تھا۔ یہاں مختلف یورپی اخباروں کے نمائندے کثیر تعداد میں جدید ترین سامانوں کے ساتھ موجود تھے۔

افتتاحی اجلاس میں زیادہ تر رسمی انداز کی تقریریں ہوئیں۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں امن اور انسانی ہمدردی کی اہمیت بیان کی۔ جاپان کے بدھسٹ پیشوا اتائی یمادا (Etair Yamada) نے بدھزم کی طرف سے جاپانی زبان میں تقریر کی۔ ان کی عمر ۹۷ سال ہو چکی ہے۔ وہ وھیل چیئر کے ذریعہ ہال تک پہنچائے گئے تھے۔

زمبابوے کے وزیر اعظم رابرٹ موگابے (Robert G. Mugabe) نے انگریزی زبان میں پرجوش تقریر کی۔ ان کی تقریر پر سب سے زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ مسیح نے (اور دوسرے مذہبوں نے) یہ تعلیم دی ہے کہ پڑوسی کو اس کا حق دو۔ اس کا تعلق صرف فرد سے نہیں بلکہ قوموں سے بھی ہے۔ آج ہر قوم کا ایک "پڑوسی" ہے اور اس پڑوسی کے ساتھ اس کو مذہبی حکم کی تعمیل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے نام گنوائے۔ مثلاً یہودی کے پڑوسی فلسطینی ہیں۔ ہندوؤں کے پڑوسی ہندستانی مسلمان ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے پڑوسی مسیحی ہیں اور مسیحی کے پڑوسی مسلمان وغیرہ۔ اسلام کی نمائندگی تیونس کے مفتی اعظم محمد مختار سلامی نے کی۔ ان کی تقریر عربی میں ہوئی۔ تمام تقریروں کے ترجمے عین اسی وقت مختلف زبانوں میں کئے جاتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کا اہتمام غیر معمولی حد تک بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اس کا ہر جزء نہایت منظم اور باقاعدہ تھا۔ میرے قریب کی کرسی پر سوڈان کے شیخ اسحاق ادریس بیٹھے ہوئے تھے۔ آجکل وہ رابطۃ العالم الاسلامی (جدہ) سے وابستہ ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ : المسلمون لا یستطیعون ان یخططوا مثل ھذا التخطیط مع انھم یمتلکون کل الامکانیات فما ھو السبب۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ انانیت۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی بڑھی ہوئی انانیت نے انھیں اس کے لئے نااہل کر دیا ہے کہ وہ کوئی بڑا اجتماعی منصوبہ تیار کریں اور اس کو تکمیل

تک پہنچا ئیں۔

شام کا کھانا "فیکلٹی کلب" میں تھا۔ یہ لووین یونیورسٹی کے تحت ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے خود ایک پوری دنیا ہے۔ میں نے قصداً گوشت نہیں لیا۔ صرف سادہ سبزی پر قناعت کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ باہر گیٹ پر آئے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر لیونارڈ اور ڈاکٹر ثانی اثنین تھے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے حسب قاعدہ واکی ٹاکی پر ہمارے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ ابھی کھانے میں مشغول تھا اس لئے وہ چندمنٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ گیٹ پر ہم لوگوں کو کھڑا دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا اس مقام پر گیا جہاں گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔ اور فوراً ہی گاڑی لے کر آ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آگئی کہ اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ۔ میں نے سوچا کہ آج دنیا کے بے شمار لوگ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہے ہیں مگر دین کے لئے کوئی دوڑنے والا نہیں۔ اگر بظاہر کوئی شخص دین کے لئے دوڑ رہا ہے تو وہ بھی دین کے اس پہلو کے لئے ہے جس میں دنیوی اور مادی قدر پیدا ہو چکی ہے۔ دینی سرگرمیوں کے ہجوم میں دین کا وہ میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے جہاں دوڑنے میں کوئی دنیوی یا مادی کشش موجود نہیں۔

اس کانفرنس میں اٹلی کے لوگ کثرت سے شریک ہیں۔ ہوائی جہاز سے آنے والوں کے علاوہ ایک اسپیشل ٹرین روم سے یہاں آئی جس میں دو ہزار اطالوی سفر کر کے بروسیلز پہنچے ہیں۔

روم سے آنے والے ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے میرا کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ اس کو انڈیا میں کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کرتا۔ پھر میں نے کہا کہ عربی میں اس کے لئے قمیص کا لفظ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اطالین میں اس کو کمیشا (Kamisha) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی اور اطالین میں بہت سے مشترک الفاظ موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور اول میں عربوں اور اطالیوں کے درمیان کتنا زیادہ تعلق پایا جاتا تھا۔

۱۴ ستمبر کو کانفرنس کے تمام شرکا مختلف گروپوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ ہر گروپ کے لئے الگ الگ موضوع مقرر کر دیا گیا جس پر وہ ڈسکشن کریں۔ اس طرح آٹھ الگ الگ ہال میں آٹھ الگ الگ اجتماعات ہوئے۔ ہر ایک میں کچھ منتخب لوگوں نے اپنے پیپر پیش کئے اور اس کے بعد ان پر بحث و تنقید ہوئی۔ موضوعات حسب ذیل تھے:

The great religions in dialogue : from Assisi to Brussels.
Religions, the Middle East and Europe.
1492-1992: the Churches of America and Europe.
Christians and Jews: their common responsibility in the new Europe.
South-North: the Churches of Africa and Europe.
Peoples, differences and the new Europe.
Voices of peace from Asia.
The economic responsibilities of the new Europe: the cost of peace.
Towards an Islamic-Christian dialogue.

اس طرح کی انٹرنیشنل کانفرنس کے انعقاد کی دوصورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شرکاء کو کسی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے۔ اور اسی ہوٹل کے کسی ہال میں تمام کارروائیاں انجام دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کو ایک سے زیادہ ہوٹل میں ٹھہرایا جائے اور کانفرنس کی کارروائی بھی مختلف مقامات پر انجام دی جائے۔ موجودہ کانفرنس کے منتظمین نے دوسری صورت اختیار کی تھی۔ انھوں نے شرکاء کو دو ہوٹلوں میں ٹھہرایا اور تقریباً دس مختلف مقام پر اس کی کارروائیاں انجام پائیں۔

یہ صورت ذاتی طور پر میرے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں بار بار کار میں سفر کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کے سفروں میں مجھے چکر آنے لگتا ہے۔ ہمارے استعمال کے لئے اگرچہ نہایت نفیس اور جدید کار موجود تھی۔ مگر بار بار آنے جانے سے میرے سر میں چکر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں شاید دنیا کا سب سے زیادہ کمزور انسان ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ پرتعیش ہوٹلوں میں ٹھہرنا اور شاندار کاروں میں سفر کرنا بھی میرے لئے عذاب کے ہم معنی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا کمزور کیوں بنایا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ شاید اس لئے کہ عجز کی سطح پر انسان کو حقیقت کی دریافت کا تجربہ کرایا جائے۔ کیوں کہ قدرت کی سطح پر حقیقت کی دریافت اتنی نادر ہے کہ ساری تاریخ انسانی میں وہ صرف پیغمبروں ہی کو حاصل ہوئی ہے۔ اس میں صرف چند ہی قابل ذکر استثنا پائے جاتے ہیں، مثلاً عمر فاروق رضؓ۔

۲۴ ستمبر کے اجلاس میں میرا مقالہ تھا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس کا عنوان " جدید چیلنج اور اسلام" مقرر کیا تھا۔ اس سشن کے لئے مجھ کو چیرمین بھی بنایا گیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے " بیک سیٹ" پر بیٹھنا زیادہ پسند ہے۔ اس لئے آپ چیرمین کسی اور کو مقرر کر دیں۔ میں صرف اپنا مقالہ پیش کر دوں گا اور اس کے بعد جو سوالات ہوں گے ان کا جواب دے دوں گا۔ میرے اصرار پر وہ لوگ راضی ہو گئے۔ چنانچہ میں نے اس اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا۔ انشاء اللہ اس کو انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

ایک عرب نے اپنی تقریر میں سیکولرزم کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ سیکولرزم کا ترجمہ عربی میں علمانیہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمہ درست نہیں۔ اس کا صحیح ترجمہ لادینیت ہے۔ سیکولرزم سادہ طور پر صرف فصل الدین عن الدولة کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب زندگی کے نظام کو غیر دینی بنیاد پر قائم کرنا ہے (المدلول الصحیح للعلمانیة هو اقامة الحیاة علیٰ غیر الدین)

میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو سیکولرزم کا مقصد مذہب کو رد کرنا (rejection) نہیں ہے بلکہ مذہب کے معاملہ میں ریاست کا غیر جانبداری (indifference) کی پالیسی کو اپنانا ہے۔ میں نے کہا کہ سیکولرزم کا نظریہ دراصل اس قدیم تصور کی تردید ہے جب کہ ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔

اس اعتبار سے سیکولرزم کی روح وہی ہے جو صلح حدیبیہ کی روح تھی۔ صلح حدیبیہ میں دونوں فریقوں کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملہ میں جنگی مداخلت نہیں کریں گے۔ اسی طرح سیکولرزم کے ذریعہ جدید ریاست نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہبی امور میں غیر جانب دار رہے گا۔ اس نظریہ نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے وہ مواقع کھول دئے ہیں جو قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ آج دینی کام کے سب سے زیادہ مواقع سیکولر ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

بالفرض اگر سیکولرزم کا نظریہ اصولی طور پر ہمارے مطابق نہ ہو تب بھی اس کا عملی نتیجہ یقینی طور پر ہمارے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ ہم کو ریاست کے تدخل سے محفوظ رکھ کر دعوتی عمل کے مواقع دیتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کو سیکولرزم سے نظریاتی اتفاق نہ ہو تب بھی عقل مندی یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ

ماحول کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے نظری پہلو کو لے کر بے فائدہ طور پر اس سے الجھنا ہرگز دانش مندی نہیں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا تھا کہ اسلام میں فکری جبریت ہے۔ اسلام تنقید کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام دوسروں کے ساتھ مفاہمت نہیں کر پاتا۔ مراکش کے ایک عرب عالم نے اس کی تردید میں کہا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں نہ صرف تنقید کی اجازت ہے۔ بلکہ اسلام میں تنقید کو حد درجہ پسند کیا گیا ہے۔ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کیا کہ اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے جو مجھ کو میرے عیوب تحفہ میں دے (رَحِمَ اللهُ امرأ أهدى إليَّ عُيوبي)

یہ بات نہایت درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے "دور فتنہ" میں تنقید کا دروازہ بند تھا۔ اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے بند دروازہ کو کھولا اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں ہر شعبۂ حیات میں اس کی شاندار عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ یہ جمود اور زوال کی نشانی ہوگی اگر تنقید کو ناپسند کیا جانے یا اس کے دروازہ کو دوبارہ بند کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۴ ستمبر کو شام کا کھانا مالین کے بشپ کے یہاں تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء وہاں لیجائے گئے۔ بشپ کی رہائش گاہ غیر معمولی طور پر بڑی اور شاندار تھی۔ چنانچہ اس کو "پیلس" کہا جاتا ہے۔ تاہم اس پیلس کے اندر ہر چیز بالکل سادہ تھی۔ حتی کہ ڈنر بھی سادہ انداز میں دیا گیا تھا۔ صدیوں پرانے اس محل میں بہت سے بشپ نے قیام کیا ہے۔ ان سب کی تصویریں ان کے سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ دیواروں پر پینٹنگ کی صورت میں نقش کی گئی تھیں۔

ایک مسیحی نے اپنا تعارف مانک (monk) کے لفظ سے کرایا۔ میں نے پوچھا کہ مانک نکاح نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیے کہ مانک بننے کے بعد آپ کو اپنی زندگی میں تنہائی (loneliness) کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور بعض اوقات بے حد شدید ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ دین کی خدمت کے لئے غیر فطری طریقہ اختیار کریں اس کا سب سے پہلا نقصان خود ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ان کی شخصیت کا ارتقاء نہیں ہو سکتا۔

۱۔ راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز الکاکوشک نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر کشمیر کی درگاہ حضرت بل کی تاریخ اور اس کے معاملات اور مسجد کے بارہ میں شرعی احکام سے تھا۔

۲۔ انگلش اخبار امرت بازار پتریکا کے نمائندہ مسٹر دنیش شرما نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کے دوران انھیں بتایا گیا کہ مسجد مقدس جگہ ہے۔ وہ عبادت کے لئے ہے۔ مسجد کو ہتھیاروں سے یا سیاسی سرگرمیوں سے پاک رکھنا چاہئے تاکہ مسجد کا مذہبی اور روحانی ماحول خراب نہ ہو۔

۳۔ انگریزی اخبار سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر راجیو سکسینہ نے ۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ" امتیازی سلوک" کے خلاف احتجاج بے فائدہ ہے۔ امتیاز زندگی کی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ امتیاز کو چیلنج کے روپ میں لیں نہ کہ ظلم کے روپ میں۔

۴۔ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر عسکری زیدی نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق بابری مسجد کے مسئلہ سے تھا۔ ان کو وہ نقطہ نظر بتایا گیا جو اس معاملہ میں قرآن و سنت کی رو سے مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہئے۔

۵۔ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر جوہر عبداللہ نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ کشمیر کے سلسلہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ خواہ کشمیر کا مسئلہ ہو یا غیر کشمیر کا، ہر جگہ حقیقت سے مطابقت کرنے میں کامیابی ہے۔ حقیقت سے ٹکرانے کا نتیجہ یکطرفہ تباہی کے سوا کچھ اور نہیں۔

انڈیا پیس سنٹر (مدراس) کے تحت ناگپور میں نومبر ۱۹۹۳ کے پہلے ہفتہ میں ایک نیشنل اسٹڈی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کا موضوع تھا:

Minorities in India and the National Mainstream

منتظمین نے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی کہ وہ اس میں ۶ نومبر ۱۹۹۳ کو اختتامی خطاب

(valedictory address) کریں۔ اس کے لئے ایک پیپر تیار کر لیا گیا تھا۔ مگر صدر اسلامی مرکز اس میں ذاتی شرکت نہ کر سکے۔ تیار کیا ہوا پیپر انھیں بھیج دیا گیا۔

۷ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندہ مسٹر مہاراج کرشن بھرت اور مسٹر ارن کمار پانڈے نے ۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ آخری پیغام کے طور پر کہا گیا کہ زندگی مشکلات میں جینے کا نام ہے۔ اس لئے ہمیں مشکلات کی شکایت کرنے کے بجائے ہم کو مشکلات کو حل کرنے کی تدبیر کرنا چاہئے۔

۸ مسٹر ونود دوا (Vinod Dua) نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۳ کو دوردرشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ وہ ۶ اکتوبر کی شام کو نیشنل چینل پر دکھایا گیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ حالات میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ قرآن میں صبر کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پورا قرآن گویا کتاب صبر ہے۔ قرآن میں براہ راست طور پر ڈیڑھ سو صبر کی آیتیں ہیں۔ اور بالواسطہ طور پر تقریباً ساری ہی آیتیں صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔

۹ جرنل آف انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (نئی دہلی) نے نومبر ۱۹۹۴ میں ایک خصوصی شمارہ (Indian Horizons) کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو ... ۷ لفظوں پر مشتمل ایک مقالہ دینے کی پیش کش کی گئی۔ اس کے مطابق انھیں ایک مفصل مقالہ تیار کر کے دیا گیا۔ اس کا عنوان تھا (Plurality of Religions & Cultures)

۱۰ بی اے جی فلمس پرائیویٹ لمیٹڈ (نئی دہلی) نے ۸ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ویڈیو پر ریکارڈ کیا۔ مسلمانوں کی الکشنی پالیسی کے سلسلہ میں بتایا گیا کہ داخلی سطح پر مسلمان جب تک منظم اور تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں محض الکشن میں کسی پارٹی کو ہرانے یا جتانے سے ان کو کچھ فائدہ ملنے والا نہیں۔

۱۱ آل انڈیا ریڈیو کی ٹیم ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا بیان اردو اور انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس بیان میں کشمیری نوجوانوں کو اس پر مبارک باد دی گئی تھی کہ آج صبح وہ پرامن طور پر حضرت بل سے باہر نکل آئے اور درگاہ اور مسجد کو نقصان سے بچا لیا۔ نیز انھیں یہ پیغام دیا گیا کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔

۱۲ انگریزی اخبار امرت بازار پتریکا کے نمائندہ مسٹر دنیش شرما نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع خاص طور پر حضرت بل کا معاملہ تھا۔ ان سے کہا گیا کہ حضرت بل کا ایک مہینہ کا محاصرہ اگرچہ ایک المیہ تھا۔ مگر اس المیہ سے ایک بہتر بات نکل آئی۔ وہ یہ کہ کشمیری نوجوانوں کو محسوس ہوا کہ تشدد کا راستہ تباہی کا راستہ ہے۔ یہ ایک مثبت آغاز کی علامت ہے۔

۱۳ دوردرشن کی ٹیم ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو اردو میں اور انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو میں آج صبح حضرت بل کے بحران کے خاتمہ پر کشمیری نوجوانوں کو اور حکومت کو مبارک باد دی گئی۔ اور یہ امید ظاہر کی گئی کہ اب کشمیر میں امن قائم ہو جائے گا اور وہاں کے لوگ دستور ہند کے تحت اپنی زندگی کی تعمیر پرامن طور پر شروع کر دیں گے۔

۱۴ مسٹر جواہر لال دویدی دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ وہ ذیل کے موضوع پر مقالہ تیار کر رہے ہیں ——— تقسیم کے بعد دہلی کے مسلمانوں کا سیاسیات میں حصہ :

Political participation of Muslims in Delhi since partition.

۱۶ اپریل ۱۹۹۳ کو انھوں نے اس سلسلہ میں صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی ملاقات کی اور موضوع سے متعلق ان کے خیالات قلم بند کیے۔

۱۵ ترکی کے ایک پروفیسر عبد الحمید برالیشیق ترکش ۱۶ نومبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے۔ وہ تفسیر قرآن کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ قرآن کی تفسیریں تو ہزاروں کی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ مگر جدید سائنٹفک اسلوب میں قرآن کی تفسیر لکھنے کا کام ابھی باقی ہے۔

۱۶ مسٹر ہلال عاطف (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی) نے ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کو انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مدارس عربیہ کے نظام اور کارکردگی کے بارہ میں تھا۔

۱۷ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر سری نواس لکشمن (ٹیلیفون ۲۶۱۸۹۲۳) نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹائمس آف انڈیا کی بمبئی اور دہلی دونوں اشاعتوں میں چھپا ہے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ ملکی اور ملی مسائل سے تھا۔

۱۸ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے نمائندہ مسٹر وینو گوپالن اور مسٹر پرمود کمار نے ۲۴ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق ہندستان میں ہندو مسلم تعلقات نیز مسلم مسائل سے تھا۔

۱۹ فیچر اینڈ نیوز الائنس (Feature & News Alliance) کے نمائندہ مسٹر ایم اے سراج نے ۲۸ نومبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانان ہند کا عملی نقشہ کیا ہونا چاہئے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ نزاعی معاملات میں آئیڈیل پر اصرار نہ کرتے ہوئے عملی حل کو قبول کر لیا جائے۔

۲۰ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر عزیز نے ۳۰ نومبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر الکشن کے موجودہ نتائج سے تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ اس الکشن کا ایک امید افزا پہلو یہ ہے کہ اس میں کیمونل اشوز کو دوبارہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

۲۱ واشنگٹن کے جرنل ای آئی آر (Executive Intelligence Review) کی دو نمائندہ لنڈا ڈی ہویوز اور سوسن براڈی نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق دو چیزوں سے تھا۔ فیملی پلاننگ کے بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر۔ انڈیا میں مسلمانوں کا مستقبل۔

۲۲ اسلامک ریپبلک نیوز ایجنسی (ارنا) کے نمائندہ مسٹر سعید عالم نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر سلمان رشدی کا مسئلہ، حالیہ ریاستی الکشن کا رزلٹ، بابری مسجد کے مسئلہ کا حل سے تھا۔

۲۳ ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا جو جن ستا کے شمارہ ۲ دسمبر ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر دو چیزوں سے تھا۔ بابری مسجد، ریاستوں کا موجودہ الکشن اور مسلمان۔

۲۴ بی بی سی (لندن) کی خاتون نمائندہ جلین رائٹ (Gillian Wright) نے ۲ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کے بعض عقائد اور عبادات تھا۔ نیز ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل پر بھی مختصر گفت گو ہوئی۔

۲۵ انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس کے سینئر کرسپانڈنٹ مسٹر جے رانانے ۴ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ نومبر ۱۹۹۳ کا ریاستی الکشن ایک اعتبار سے گویا ریفرنڈم تھا۔ یوپی میں بی جے پی کی حکومت نہ بننا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ رام مندر بنانا یا دوسری مسجدوں کو ڈھانا ہندو کا مین کنسرن نہیں۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ میں چھپا ہے۔

۲۶ ہندی اخبار ہندستان کے نمائندہ مسٹر موہن سنگھ نے ۱۴ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نیشنل اشوز سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی فطرت کے تحت مل جل کر ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مگر نا اہل لیڈر جھوٹے اشو کو بھڑکا کر دونوں کے درمیان گڑبڑ کراتے رہتے ہیں۔

۲۷ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی۔ اس تقریر کا تعلق کیرکٹر بلڈنگ سے تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ سماجی زندگی میں ایک فرد کو کامیابی اور ترقی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

۲۸ امریکی ادارہ (International Religious Foundation) کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر ٹامس والش (Thomas G. Walsh) ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے انٹر ریلیجس ڈائیلاگ کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کی اہمیت سے اتفاق کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا کہ اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان ٹکراؤ کے بجائے ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے۔

۲۹ بھارتیہ آریہ پرتی نیدھی سبھا کے زیر اہتمام ۱۹ دسمبر ۱۹۹۳ کو ایک جلسہ ہندو مہا سبھا بھون، دہلی میں ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندو مسلم اتحاد اور شانتی کے موضوع پر تقریر کی۔

۳۰ امریکہ (لاس اینجلیز) میں دسمبر ۱۹۹۳ میں انٹرنیشنل سیرت کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سیرت کے موضوع پر ایک پیپر پیش کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

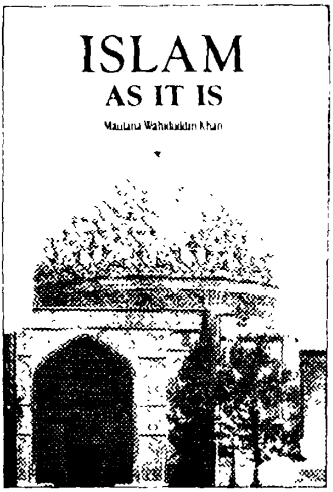
ہندستان کے لیے

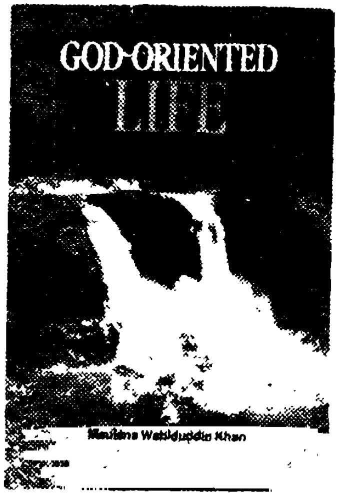
ایک سال	Rs 70
دو سال	Rs 135
تین سال	Rs 200
پانچ سال	Rs 300
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500

بیرونی ممالک کے لیے

	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے ناس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



الرسالہ
Al-Risala

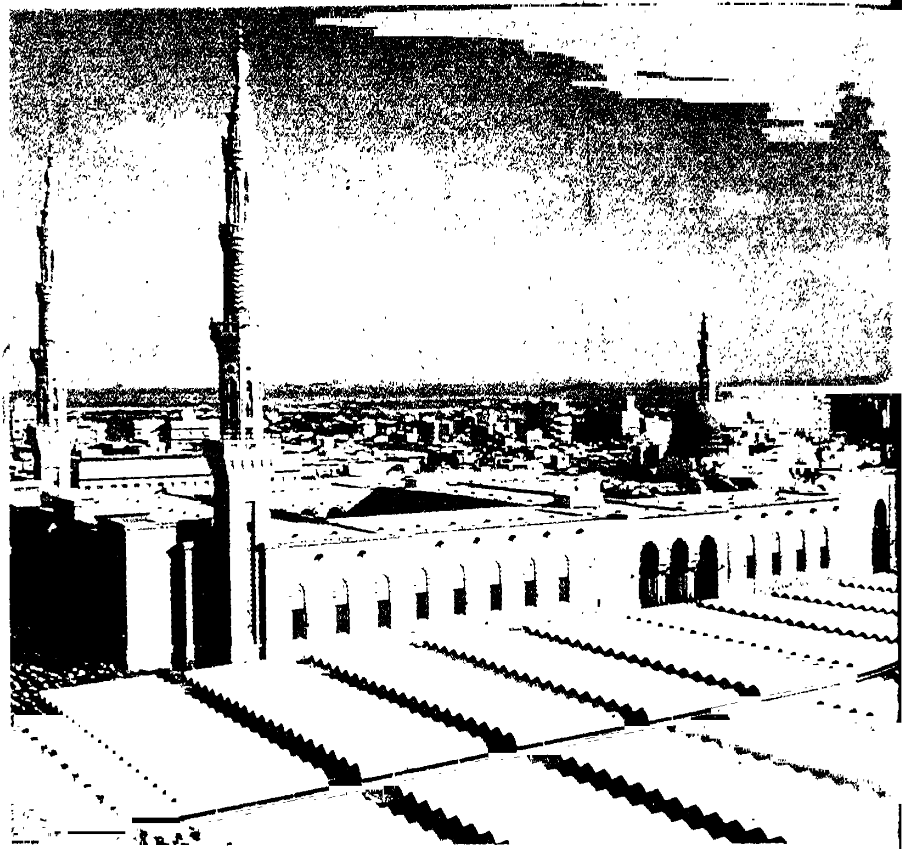
August 1994 Issue 213 Rs.

مطالعہ سیرت

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز



سیرت کا مطالعہ انسانی زندگی کے ماڈل کا مطالعہ ہے

فرد کے لئے بھی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کیلئے بھی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوار حکمت	-
اقوال حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعدد ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/
اسلام کا تعارف	4/
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ 7/-	7/-
الاسلام یتحدی 85/-	85/-

ھندی

	-
سچائی کی تلاش	9
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

آڈیو کیسٹ

حقیقت ایمان
حقیقت نماز
حقیقت روزہ
حقیقت زکوٰۃ
حقیقت حج
سنت رسولؐ
میدان عمل
پیغمبرانہ رہنمائی
اسلامی دعوت کے جدید امکانات
اسلامی اخلاق
اتحاد ملت
تعمیر ملت
نصیحت لقمان

ویڈیو کیسٹ

حقیقت روزہ 0/-

Arises	85/-
ammad	85/-
Prophet of Revolution	
m As It Is	40/-
-Oriented Life	60/-
gion and Science	40/-
an Muslims	65/-
Way to Find God	12/-
Teachings of m	15/-
Good Life	12/-
Garden of adise	15/-
Fire of Hell	15/-
Know Thyself!	4/-
ammad	5/-
Ideal Character	
ligh Movement	20/-
ygamy and Islam	3/-
rds of the Prophet	--
m the Voice	--
Human Nature	
m the Creator	--
Modern Age	

AL-RISAL BOOK CENTRE
1 Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مطالعۂ سیرت

اگست ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۳

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

تمہید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی ایک استثنائی شخصیت ہیں۔ آپ واحد انسان ہیں جن کی زندگی میں انسانیتِ اعلیٰ کے تمام پہلو اپنی کامل صورت میں جمع ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ گویا کامل انسانیت کا مطالعہ ہے۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ انك لعلیٰ خلق عظیم۔

سیرتِ رسول ایک جامع قسم کی انسانی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ وہ نہ صرف حیاتِ بشری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے بلکہ مختلف زمانوں کی رعایت بھی اس میں کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔

تاہم سیرتِ رسول کا مطالعہ سادہ طور پر ڈکشنری کے انداز میں نہیں کیا جا سکتا۔ ڈکشنری میں ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنا مطلوب لفظ حروف تہجی کی ترتیب سے نکال کر دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح سیرت کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ حدیث اور سیرت کی مروجہ کتابوں میں متعلقہ ابواب کو کھول کر دیکھ لیا جائے۔ ایسا مطالعہ سیرت کا کامل مطالعہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے (الاحزاب ۲۱)

رسول کی زندگی میں بلاشبہ حیاتِ بشری کے لیے کامل نمونہ ہے۔ مگر اس نمونہ کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنے کے لیے وہ شخصیت درکار ہے جس کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ ایک خدا ہی اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے اتنا زیادہ باخبر ہو جائے کہ آخرت کے سوا ہر چیز اس کو بے حقیقت نظر آنے لگے۔ وہ معرفت کی اس سطح پر پہنچا ہوا ہو کہ اللہ کی یاد ہی اس کی سب سے بڑی ذہنی سرگرمی بن گئی ہو۔

آدمی جب روحانی بلندی یا شعوری ارتقاء کے اس درجہ پر پہنچتا ہے تو وہ آخری حد تک حقیقت شناس بن جاتا ہے۔ اور ایک سچا حقیقت شناس ہی سیرت کو اس کی تمام گہرائیوں کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ آدمی حقیقت شناسی کے جس مرتبہ پر ہوگا اسی کے بقدر وہ سیرت کے رموز کو سمجھنے میں کامیاب ہوگا۔

سیرت کا مطالعہ گویا معرفت کے سمندر میں غواصی ہے۔ غواصی کا یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا لوگ اپنی ہمت کے مطابق ہمیشہ اس سے نئے نئے موتی نکالیں گے۔ ہر دور کے انسان اس خزانہ سے مالا مال ہوتے رہیں گے، وہ کبھی کسی کے لیے خالی ہونے والا نہیں۔

دلیل نبوت

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (الانعام ۱۲۴) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کو کہاں رکھے۔ یعنی پیغمبر کو بھیجنے کے لیے وہ مناسب شخص اور مناسب وقت اور مناسب جگہ کو بخوبی جانتا ہے اور اسی کے مطابق اس نے اپنے پیغمبر کو مبعوث کیا ہے۔

اس آیت میں جعل سے مراد وضع (placement) ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بنائے کعبہ کے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ، تو اسماعیل کی نسل میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹) اس دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب مکہ میں پیدا ہوئے۔ گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ وضعِ رسالت انتہائی موزوں تاریخی لمحہ میں وقوع میں آیا۔ پوری نسل اسماعیل میں سے اس انسان کا انتخاب کیا گیا جو اس منصب کے لیے موزوں ترین تھا۔ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جو اس کام کے لیے سب سے زیادہ مناسب ملک تھا اور اس وقتِ خاص میں ان کا ظہور ہوا جب کہ تمام موافق اسباب حیرت انگیز طور پر ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ حیرت انگیز ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مختلف موافق اسباب کا وہ اجتماع ہے جو عین ان کی مدت عمر میں بیک وقت ان کے حق میں اکٹھا ہو گئے۔ آپ کے حق میں یہ غیر معمولی تاریخی مساعدت بیک وقت دلیل توحید بھی ہے اور دلیلِ نبوت بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم کے پیچھے ایک عظیم ذہن اور عظیم ارادہ والی ہستی موجود ہے۔ نیز یہ کہ یہی وہ ہستی ہے جس نے محمدِ عربی کو اتنے زیادہ موزوں تاریخی وقت پر اور اتنے زیادہ موزوں جغرافی مقام پر مبعوث فرمایا۔ خدائے عظیم و برتر کے سوا کوئی بھی ایسا کرنے پر قادر نہ تھا۔

کوئی بڑا کارنامہ یا کوئی انقلابی کام انجام دینے کے لیے تین چیزیں انتہائی طور پر ضروری ہیں ـــــ اعلیٰ قائد، موزوں مقام، موافق تاریخی حالات۔ اسلامی انقلاب کے حق میں یہ تینوں اسباب اعلیٰ ترین صورت میں جمع ہو گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم متفقہ طور پر اعلیٰ ترین قائدانہ اوصاف

کے مالک تھے۔ عرب مطلوبہ انقلاب کے لیے موزوں ترین مقام تھا۔ جس کا اعتراف اکثر مورخین نے کیا ہے۔ اسی طرح تاریخی وقت کے اعتبار سے وہ وقت سب سے زیادہ موزوں تھا جب کہ آپ کی بعثت ہوئی۔

کوئی انقلابی کام انجام دینے کے لیے تاریخ کی موافقت انتہائی طور پر ضروری ہے۔ تاریخی اسباب کی موافقت کے بغیر اس دنیا میں کوئی بڑا انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آپ نے عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ حیرت انگیز طور پر اعلیٰ ترین تاریخی اسباب آپ کے حق میں جمع ہو گئے تھے۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۵۷۰ ء میں ہوئی۔ عین اسی سال اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا۔ یمن کے حاکم ابرہہ نے ہاتھیوں کی ناقابل تسخیر فوج کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبۃ اللہ کو ڈھادے مگر معجزاتی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کے اوپر کنکریوں کی بارش ہوئی جس میں ساری فوج بھس بن کر رہ گئی۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا جس نے اہل عرب کی نظر میں توحید کی عظمت کو از سر نو قائم کر دیا اور شرک و بت پرستی کا پورا نظام بے قیمت ہو کر رہ گیا۔ یہی بات ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۵، ۱۰۶ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ عین اس عظیم مظاہرۂ توحید کے زمانہ میں پیغمبر اسلامؐ کی پیدائش ہوئی جو اس لیے دنیا میں بھیجے گئے کہ وہ شرک کو ختم کریں اور توحید کی عظمت دنیا میں قائم کر دیں۔ پیغمبر توحید کا عین عام الفیل میں پیدا ہونا خدائی منصوبہ بندی کی ایک حیرت انگیز مثال ہے

۲۔ پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ وہ توحید کی دعوت کا کام مکہ میں شروع کریں۔ مکہ کی خصوصیت یہ تھی کہ صدیوں کے حالات کے نتیجہ میں وہ عرب قیادت کا مرکز بن گیا تھا۔ مکہ میں بین اقوامی تجارت اور بین اقوامی تعلق کی روایات پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہاں ایسے لوگ موجود تھے جن کو اپنے زمانہ میں اصحاب فکر اور اصحاب قیادت کا درجہ حاصل تھا۔ مثال کے طور پر ابوبکر بن ابی قحافہ اور عمر بن الخطاب، وغیرہ۔ اس قسم کے اعلیٰ افراد کو اسلامی تحریک کی حمایت میں لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اسلامی جماعت کے بیشتر تاریخ ساز افراد مکہ ہی سے حاصل ہوئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں نظر آتی ہے کہ اے اللہ، اسلام کو ابوالحکم بن ہشام

یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ طاقت دے (اللھم ایّد الاسلام بابی الحکم بن ھشام او بعمر بن الخطاب) السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۳۵

تاہم مکہ والوں کے لیے شرک ایک اقتصادی انٹرسٹ کا معاملہ تھا۔ انھوں نے عرب کے ۳۶۰ قبیلوں کے ۳۶۰ بت کعبہ میں رکھ دیے تھے۔ یہ قبیلے سال بھر مکہ آتے تھے۔ ان کی وجہ سے مکہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ ان بت پرست قبائل کی مکہ میں آمد ٹھیک اسی طرح تجارتی نوعیت رکھتی تھی جس طرح کسی سیاحتی ملک میں سیاحوں کی آمد تجارتی اہمیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاحت کو انڈسٹری سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مکہ والوں کے لیے شرک ایک انڈسٹری تھی۔ ان کے بیشتر تجارتی مفادات اسی انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ اس لیے مکہ میں عمومی سطح پر توحید کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہی بات تھی جس کو قرآن کے بیان کے مطابق، اہل مکہ نے اس طرح کہا تھا: اگر ہم تمہارے ساتھ ہو کر توحید کی اس ہدایت پر چلنے لگیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے (القصص ۵۷)

۲۔ مکہ میں جب حصول افراد کا وہ کام مکمل ہو گیا جس کو قرآن میں قطع طرف (آل عمران ۱۲۷) کہا گیا ہے یعنی ان کے بہتر حصہ کو کاٹ کر نکال لینا، تو اس کے بعد آپ نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ ہجرت کوئی فرار نہیں تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ جا کر وہاں کے امکانات کو استعمال کیا جائے۔ یہ تاریخی امکانات اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مدینہ میں پوری طرح جمع کر دیے تھے۔

مثلاً مدینہ کے علاقہ میں یہود کے تین قبائل (نضیر، قُریظہ، قینقاع) کی موجودگی۔ ۷۰ء میں رومی شہنشاہ تیتس (Titus) نے فلسطین کو فتح کیا۔ اس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد یہودی جلاوطن ہو کر مختلف ملکوں میں چلے گئے۔ ان میں سے کچھ مدینہ بھی آئے۔ چند صدیوں میں ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ ان یہودیوں کے اختلاط سے اہلِ مدینہ کو ایک آنے والے نجات دہندہ کا تصور ملا جو اچانک آکر قوم کے تمام مسائل کو حل کر دے گا۔

چنانچہ ہم سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حج کے موسم میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبائل عرب سے ملنے کے لیے نکلے تو آپ کی ملاقات مدینہ کے قبیلہ خزرج کے کچھ آدمیوں سے ہوئی۔ ان کے سامنے آپ نے اسلام پیش کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے آپ کی بات سنی تو آپس میں کہنے لگے:

یاقوم، تعلمّو واللہ انہ للنبیّ الذی توعدکم بہ یہود فلا تسبقنکم الیہ فاجابوہ فیما دعاھم الیہ۔
(سیرۃ النبی لابن ہشام ۲/۳۸)

لوگو سمجھ لو۔ خدا کی قسم، ضرور یہ وہی نبی ہے جس کا ذکر تم سے یہودی کیا کرتے تھے۔ دیکھو، کہیں وہ اس کی جانب تم پر سبقت نہ لے جائیں۔ پس جس چیز کی دعوت آپ نے انھیں دی اس کو انھوں نے قبول کر لیا۔

یہی معاملہ خود مدینہ کے عربوں کے سلسلہ میں ایک اور شکل میں پیش آیا۔ ہجرت سے چند سال پہلے ۶۱۸ء میں مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ ان حالات میں وہ محسوس کرنے لگے کہ انھیں ایک قومی قائد کی شدید ضرورت ہے۔ یہی بات ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح فرمایا :

کان یومُ بعاثَ یوماً قدّمہُ اللہ لرسُولہ صلے اللہ علیہ وسلم فقَدِمَ رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وقد افترقَ ملأھُم وقُتِلت سَرواتھم وجُرِحوا فقدّمَہُ اللہ لرسُولہ صلے اللہ علیہ وسلم فی دُخولِھم فِی الاسلام۔ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۷/۱۳۰)

بعاث کا واقعہ ایک ایسا واقعہ تھا جو اللہ نے اپنے رسول کی خاطر تمہید کے طور پر برپا کیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو ان کے سردار متفرق ہو چکے تھے ان کے سربرآوردہ لوگ مقتول اور زخمی ہو گئے تھے چنانچہ اس واقعہ کو اللہ نے اپنے رسول کے لیے بطور تمہید برپا کیا جو اہل مدینہ کے لیے دخولِ اسلام میں معاون بنا۔

یہی بات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس طرح کہی ہے کہ مدینہ کی ایک قبائلی جنگ میں بہت زیادہ خون بہا تھا جو ۶۱۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد امن پوری طرح قائم نہیں ہو سکا تھا۔ محمدؐ کو مدینہ بلا کر وہاں کے بہت سے عرب غالباً یہ امید کر رہے تھے کہ وہ مخالف گروہوں کے درمیان ثالث کا کام کریں گے۔ اور یہود سے اہل مدینہ کے ربط نے غالباً انھیں ایک مسیحائی مذہبی قائد کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا ہو گا جو کہ انھیں ظلم سے نجات دلائے اور ایک ایسی سلطنت بنائے جس میں انھیں انصاف مل سکے :

Much blood had been shed in a battle at about 618, and peace was not fully restored. In inviting Muhammad to Medina, many of the Arabs there probably hoped that he would act as an arbiter among the opposing parties, and their contact with the Jews may have prepared them for a messianic religious leader, who would deliver them from oppression and establish a kingdom in which justice prevaild. (12/607)

۴۔ پیغمبر اسلام کے مشن کا ایک جزء یہ تھا کہ وہ اس دور کو دنیا سے ختم کر دیں جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے مطلق شہنشاہیت (absolute imperialism) سے تعبیر کیا ہے۔ یہی سیاسی نظام ہے جو قدیم زمانہ میں انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کی پیدائش جزیرہ نمائے عرب میں ہوئی جو اس زمانہ کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں، رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے درمیان میں واقع تھا۔

اس مقصد کے لیے آپ کا مقابلہ ان شہنشاہیتوں کے ساتھ پیش آنے والا تھا۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے آپ کا ظہور انتہائی موزوں وقت میں ہوا۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان پچیس سالہ جنگ (۶۰۳ - ۶۲۸ ء) پیش آئی۔ یہ دونوں اپنے زمانہ میں ناقابل تسخیر حد تک طاقت ور سلطنتیں تھیں۔ مگر پیغمبر اسلام کی بعثت حیرت انگیز طور پر عین اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دونوں سلطنتیں آپس میں لڑ کر تباہ ہو چکی تھیں۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ میں اشارہ کیا گیا ہے (غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون)

پیغمبر اسلام کی پیدائش کے بعد ۶۰۳ ء میں ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ تباہ کن جنگ کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ ۶۱۶ ء میں یروشلم سمیت رومن ایمپائر کی مشرقی سلطنت کا بڑا حصہ ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

اس کے بعد قیصر روم کے اندر نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے تیاری کر کے ۶۲۳ ء میں ایران کے اوپر جوابی حملہ کیا۔ ۶۲۴ ء میں اس نے ایران پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ ۶۲۷ ء میں اس نے اپنے مقبوضہ علاقے دوبارہ ایرانیوں سے واپس لے لیے۔ تاہم ان دو طرفہ لڑائیوں میں دونوں عظیم سلطنتوں کی طاقت ٹوٹ گئی۔ دونوں کمزور ہو کر رہ گئیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا۔ آپ نے اور آپ کے بعد آپ کے اصحاب نے دونوں سلطنتوں سے ٹکر لی اور دونوں کو توڑ کر تاریخ میں ایک نئے دور آزادی کا آغاز کیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بازنطینی ایمپائر (Byzantine Empire) کے نام سے ۲۶ صفحہ کا ایک مقالہ شامل ہے۔ اس کے مصنف بازنطینی تاریخ کے ایک اکسپرٹ پروفیسر نکل (Donald MacGillivray Nicol) ہیں۔ مسلم عہد کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

۶۳۲ء میں پیغمبر کی وفات کے بعد خلفاء نے عرب بدوؤں کی طاقت کا رخ ایک بامقصد اور منظم منصوبۂ فتح کی طرف موڑ دیا۔ نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ ۶۳۶ء میں بازنطینی فوج کو دریائے یرموک کے کنارے ایک جنگ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد فلسطین اور شام کا دروازہ عربوں کے لیے کھل گیا۔ اسکندریہ نے ۶۴۲ء میں ہتھیار ڈال دیا اور پھر ہمیشہ کے لیے مصر کا صوبہ بازنطینیوں کے اقتدار سے نکل گیا۔ اسی درمیان عربوں نے میسوپوٹامیا کے علاقہ میں پیش قدمی کی اور جلد ہی ایرانی فوج کو شکست دے کر ان کی راجدھانی کو فتح کر لیا۔ اس طرح ایرانی شہنشاہیت کی لمبی تاریخ ختم ہوگئی۔

اس وقت کی بازنطینی سلطنت اور ایرانی سلطنت کے کم از کم تین پہلوؤں نے عربوں کے لیے اس شاندار کامیابی کو آسان بنا دیا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کی۔ اوّل، دونوں سلطنتیں جنگوں کے نتیجہ میں بالکل ختم ہو چکی تھیں اور ۶۳۲ سے پہلے انھوں نے اپنی فوجوں کو گھٹا دیا تھا۔ دوم، دونوں ہی سلطنتیں عرب سرحد پر اپنی ماتحت حکومتوں کی مدد بند کر چکی تھیں جنھوں نے پچھلی ایک صدی سے صحرائی بدوؤں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ سوم، اور خاص طور پر بازنطینیوں کے معاملہ میں مذہبی اختلافات جنھوں نے شامیوں اور مصریوں کی قسطنطنیہ کے ساتھ وفاداری کو کمزور کر دیا تھا:

At least three aspects of the contemporary situation of Byzantium and Persia account for the phenomenal ease with which the Arabs overcame their enemies: first, both empires, exhausted by wars, had demobilized before 632; second, both had ceased to support those client states on the frontiers of the Arabian Peninsula that had restrained the Bedouin of the desert for a century past; third, and particularly in reference to Byzantium, religious controversy had weakened the loyalties that Syrians and Egyptians rendered to Constantinople. (3/557)

۵۔ موسموں کی تبدیلی کا تعلق سورج کے گرد زمین کی گردش پر ہے۔ شمسی کیلنڈر اسی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ چنانچہ شمسی کیلنڈر میں ہر موسم ہمیشہ ایک ہی مہینہ میں آتا ہے۔ مثلاً دسمبر میں ہمیشہ سردی اور جون میں ہمیشہ گرمی۔ مگر قمری کیلنڈر، جس کا سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے، وہ قمری مہینوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اس لیے قمری کیلنڈر میں مہینے ہمیشہ موسم کے مطابق نہیں ہوتے۔ مثلاً رمضان کا مہینہ کبھی جاڑے کے موسم میں آتا ہے اور کبھی گرمی کے موسم میں۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جب اللہ کے حکم سے کعبہ کی تعمیر کی اور حج کا نظام

قائم کیا تو انھوں نے اس کا نظام قمری کیلنڈر کی بنیاد پر بنایا تھا۔ یعنی یہ کہ حج کی عبادت ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کی جائے۔ قدیم زمانہ میں مکہ کا قبیلہ قریش کعبہ کا متولی تھا۔ ان کی معاشیات کا سب سے بڑا ذریعہ کعبہ کا حج تھا۔ عرب کے تمام قبائل ہر سال حج و زیارت کے لیے مکہ آتے۔ وہ اس پر چڑھاوے چڑھاتے۔ اس کے علاوہ ان کے آنے سے مکہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا جس طرح سیاح آج کل جس ملک میں بڑی تعداد میں آتے ہیں وہاں کی تجارت کو ان سے فروغ حاصل ہوتا ہے۔

قریش نے دیکھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ جب معتدل موسم میں پڑتا ہے تو زائرین کے قافلے زیادہ بڑی تعداد میں مکہ آتے ہیں۔ اور جب ذی الحجہ کا مہینہ سخت موسم میں پڑتا ہے تو زائرین کی تعداد کافی کم ہو جاتی ہے۔ اس تجربہ کے بعد قریش نے حج کے نظام کو بدل دیا۔ انھوں نے اس کو قمری کیلنڈر سے ہٹا کر شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ تاکہ حج کی تاریخ کو ہمیشہ معتدل اور موافق موسم میں انجام دیں اور اس طرح اپنے تجارتی مفاد کو بلا روک ٹوک حاصل کر سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ آپ حج کی عبادت کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کر دیں۔ اس تبدیلی کا اعلان آپ فتح مکہ (۸ ھ) کے موقع پر کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی اصلاح کے سلسلہ میں آپ کی ایک مستقل سنت یہ تھی کہ روایات کو توڑے بغیر ان کو نافذ کیا جائے۔ اگر آپ فتح مکہ کے دن اس کا اعلان فرماتے تو ایسی کارروائی روایات کو توڑے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

اصل یہ ہے کہ قمری کیلنڈر چونکہ شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اس لیے ۳۳ سال کی گردش کے بعد دونوں ایک دوسرے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رمضان کا مہینہ اس سال اگر فروری میں پڑے تو ۳۳ سال کے بعد دوبارہ وہ فروری کے مہینہ میں آجائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو مہینہ پہلے یہ ۳۳ سالہ دور پورا ہونے والا تھا۔ اور دوبارہ حج کا موسم ذی الحجہ کے مہینہ میں آنے والا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد نہ تو حج کے نظام میں تبدیلی کا اعلان فرمایا اور نہ اس کے بعد آنے والے حج میں آپ نے شرکت کی۔ آپ نے ۱۰ھ میں پہلا حج کیا جس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس سال کا حج اپنے آپ خود گردش کے نظام کے نتیجہ میں ذی الحجہ میں

پڑنے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پہلے مکہ جا کر حج ادا فرمایا۔ اس حج میں آپ نے جو خطبہ دیا، اس میں آپ نے اعلان کر دیا اور فرمایا کہ اے لوگو، زمانہ گھوم گیا پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : حقیقتِ حج، صفحہ ۳۲)

یعنی ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے اب حج کا موسم دوبارہ ذی الحجہ کے مہینہ میں پڑ رہا ہے۔ یہی نظام مشیتِ خداوندی کے مطابق ہے۔ اب قریش کا جاری کردہ نظام ختم کیا جاتا ہے۔ آیندہ ہمیشہ کے لیے قمری کیلنڈر کے مطابق، ذی الحجہ کے مہینہ میں حج ادا کیا جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ روایات کو توڑے بغیر اصلاحات کرنا۔ اسی لیے آپ نے حج کی تاریخوں میں اصلاح فرمائی مگر یہ کام آپ نے روایات کو توڑے بغیر انجام دیا۔ یہ بے حد حیرت انگیز بات ہے کہ آپ کی پیدائش اور آپ کی وفات انتہائی موزوں وقت میں ہوئی۔ ایک طرف مذکورہ ۳۳ سالہ دور پورا ہوا، اور دوسری طرف آپ اپنی مدت حیات پوری کر کے اس مخصوص مہینہ اور سال میں پہنچ گئے جب کہ آپ روایت شکنی کے بغیر فطری انداز میں حج کے نظام کی اصلاح کر سکیں۔ یہاں واضح طور پر آپ کی پیدائش اور آپ کی وفات کے وقت کی تعیین میں اس برتر خالق کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جو تخلیق کے پورے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے۔ آپ کی عمر اور خارجی زمانہ میں اگر یہ مطابقت نہ ہوتی تو آپ اتنی صحت کے ساتھ اپنے مشن کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ واقعہ بھی اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کی ایک ایمان افروز مثال ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں یہ بھی تھا کہ آپ حج کی سالانہ عبادت میں اس طرح اصلاح کریں کہ وہ شمسی کیلنڈر سے ہٹ کر قمری کیلنڈر پر آجائے۔ اور اس عمل کے درمیان روایات کو بھی توڑنا نہ پڑے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو محدود عمر کے ایک انسان کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس انقلابی تبدیلی کو قائم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مصلح کی پیدائش بالکل حسابی انداز میں ایسے زمانہ میں ہو جب کہ کائنات کا آفاقی نظام بھی اس کی مدت حیات کے ساتھ مساعدت کر رہا ہو۔ صرف خداوند عالم ہی اس پر قادر ہو سکتا تھا۔ اور پیغمبر اسلام کی زندگی میں ان آفاقی اسباب کا جمع ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ خداوند عالم کے فرستادہ تھے۔

۶۔ دنیا کے تمام انقلابات، خالص نظریاتی اعتبار سے، ناکام انقلابات ہیں۔ کیوں کہ کوئی بھی انقلاب اپنے نظریاتی معیار والا نظام نہ بنا سکا۔ تمام انقلابات صرف ارباب حکومت کی تبدیلی کے ہم معنی ہیں۔ ان کا آغاز خوش نما نظریات کی تبلیغ سے ہوا۔ مگر جب عملی انقلاب کی نوبت آئی تو ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ایک گروہ کی سیاسی حکمرانی ختم ہو کر دوسرے گروہ کی سیاسی حکمرانی قائم ہو گئی۔ انقلابات کی تاریخ میں اسلامی انقلاب واحد انقلاب ہے جس میں عین اس کے نظریہ کے مطابق، ایک مثالی معاشرہ بنا اور ایک مثالی سماج قائم ہوا۔

اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بقیہ تمام انقلابات دوسری اور تیسری نسل میں مکمل ہوئے۔ جب کہ اسلامی انقلاب اپنی پہلی ہی نسل میں عملی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا۔ کسی نظریاتی تحریک کی جو پہلی نسل ہوتی ہے اس کے افراد کے لیے وہ نظریہ ذاتی دریافت ہوتا ہے۔ ان کے اندر اس نظریہ کے حق میں کامل اخلاص موجود رہتا ہے۔ جب کہ دوسری اور تیسری نسل تک پہنچ کر نظریہ صرف ایک قسم کا رسمی عقیدہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زندگی میں قوتِ محرکہ کے اعتبار سے وہ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔

ڈیموکریسی (جمہوریت) کا نظریہ سترھویں صدی کے کچھ یورپی مفکرین نے پیش کیا۔ مگر عملی صورت میں ڈیموکریسی اٹھارویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ ۱۷۷۶ میں امریکہ میں اور ۱۷۸۹ میں فرانس میں۔ اس طرح ڈیموکریسی اپنی پہلی نسل میں صرف نظریہ کے درجہ میں باقی رہی۔ وہ اپنی تیسری نسل میں پہنچ کر عملی واقعہ بن سکی جب کہ اس کے ابتدائی نظریہ ساز ختم ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریسی کے نام پر آنے والے انقلابات ڈیموکریسی کا حقیقی عملی نمونہ نہ بن سکے۔

اسی طرح کمیونزم کا نظریہ انیسویں صدی میں ابھرا۔ مگر اس کا عملی نفاذ بیسویں صدی میں کمیونسٹوں کی دوسری اور تیسری نسل میں ہوا۔ پہلی نسل کے افراد کے لیے اس کو عملی روپ دینا ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ حکمرانوں کی تبدیلی کے معنی میں تو کمیونزم نافذ ہو گیا۔ مگر اس کا نظریاتی معیار کبھی اور کسی ملک میں واقعہ نہیں بنا۔

اس کے برعکس اسلام کا نظریہ پہلی ہی نسل (محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے زمانہ میں اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اگر مثال کے طور پر ایسا ہوتا کہ عرب کی فتح بنو امیہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوتی اور ایران و روم کی فتوحات بنو عباس کی خلافت کے زمانہ میں انجام پاتیں تو ناممکن

تھا کہ اسلام کی تاریخ میں حیات انسانی کا وہ مثالی ماڈل موجود ہو جو اسلام کے پہلے دور میں بنا اور جو عام انسانوں کے لیے دائمی طور پر مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگلی نسل تک پہنچتے پہنچتے اسلام کی اصل اسپرٹ لوگوں میں کافی کمزور ہو چکی تھی۔

کیا وجہ ہے کہ دوسرے انقلابات کی تکمیل کئی نسلیں گزرنے کے بعد ہوئی۔ مگر اسلامی انقلاب پہلی ہی نسل میں مکمل ہو گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ دوسرے نظریات کو پہلی نسل میں بڑی تعداد میں مردانِ کار حاصل نہ ہو سکے۔ جب کہ اسلامی نظریہ کو ہی پہلی ہی نسل میں مردان کار کی ایک طاقت ور ٹیم مل گئی جس نے غیر معمولی جد و جہد اور قربانی کے ذریعہ پہلی ہی نسل میں اس کو تکمیل کے آخری مرحلہ تک پہنچا دیا۔

اوپر جو آیت ہم نے نقل کی ہے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کو کہاں رکھے (الانعام ۱۲۴) اسی کا ایک پہلو یہ تھا کہ پیغمبر کی جائے پیدائش اور مقام عمل کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا جائے جہاں اس کو پہلے ہی مرحلہ میں اعلیٰ صلاحیت کے مردان کار مل سکیں۔ ظہور محمدی کے زمانہ کو دیکھئے تو بظاہر عرب کا ملک اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ غیر اہم نظر آتا ہے۔ اس وقت عربوں کی تصویر دنیا کی نظر میں کیا تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ فردوسی اپنے شاہنامہ میں ان کے بارہ میں لکھتا ہے کہ اے آسمان تجھ پر افسوس ہے کہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عربوں کا معاملہ اب یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ ایرانی تخت کی آرزو کر رہے ہیں :

زشیر شتر خوردن وسوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس وقت صرف خدا ہی جان سکتا تھا کہ اس بظاہر غیر اہم قبائلی مجموعہ کے اندر ایک عظیم قوم بننے کے امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ مارگولیتھ نے عربوں کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کہا ہے، مگر یہ اعتراف واقعہ کے ظہور میں آنے کے بعد کا ہے۔ ظہور واقعہ سے پہلے صرف خدا ہی یہ جا سکتا تھا کہ عرب قوم کے اندر کیا امکانی اوصاف چھپے ہوئے ہیں۔

ان عربوں میں دوسری غیر معمولی صفات کے ساتھ ایک انوکھی صفت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے تعصب سے خالی تھے۔ ان کے مزاج میں یہ چیز رچی بسی ہوئی تھی کہ وہ حق کا فوراً اعتراف کر لیں۔ ان

اسی صلاحیت کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ پیغمبر کی زندگی ہی میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی آپ پر ایمان لاکر آپ کے ساتھی بن گئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث کرنا کوئی سادہ بات نہیں تھی۔ یہ ایک انتہائی اعلیٰ منصوبہ بندی کا معاملہ تھا۔ اس میں منصوبہ ساز کو یہ جاننا تھا کہ ساری دنیا میں وہ کون سا مخصوص مقام ہے جو پیغمبر اسلام کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے موزوں ترین ہے۔

نہ صرف پیغمبروں کی تاریخ بلکہ کوئی تخلیقی نظریہ پیش کرنے والے ہر آدمی کی تاریخ بتاتی ہے کہ معاصر زمانہ میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس کے پیغام کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور اس کے زمانہ ہی میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ عرب جیسی قوم میں مبعوث کرنے ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اپنی زندگی ہی میں پیغمبر اسلام کو کثیر تعداد میں ایسے ساتھی مل گئے جو مطلوبہ انقلاب کے لیے جہادِ عظیم کر سکیں۔

یہ واقعہ اتنا اہم اور اتنا زیادہ استثنائی تھا کہ بائبل میں اس کے بارہ میں پیشگی خبر دے دی گئی۔ بائبل (کتاب استثنا) میں ہے کہ مردِ خدا موسیٰ نے جو دعا دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے کہ۔ اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ اور وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا:

and he came with ten thousands of saints.
(Deuteronomy 33:2)

بائبل کی اس آیت میں سینا سے آنے والے حضرت موسیٰ ہیں۔ شعیر سے آنے والے حضرت مسیح ہیں اور فاران سے آنے والے سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے ساتھ یہ انوکھا واقعہ پیش آیا کہ وہ آغازِ نبوت کے صرف ۲۰ سال بعد دس ہزار صحابہ کے ساتھ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے:

He received his prophetic call in about 610, and in January 630 he entered Mecca with 10,000 men. (VII/84)

سیرت کی رہنمائی

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے پیغمبر اسلامؐ کو تاریخ کا سپر کلی سکسس فل انسان بتایا ہے۔ مگر آپ کی حیثیت ایک ہیرو کی نہیں تھی بلکہ ایک رہنما کی تھی۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ نے دراصل اپنی زندگی سے ہر زمانہ کے انسان کو سپریم سکسس (supreme success) کا راز بتایا ہے۔ آپ اگر ایک طرف اعلیٰ ترین کامیاب انسان تھے تو دوسری طرف آپ کی زندگی حصول کامیابی کے لیے اعلیٰ ترین معیار (super model) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مضمون میں اسی حیثیت سے آپ کی سیرت کا مختصر مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ممکن سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت عرب میں مختلف مسائل تھے ——— کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر نے عرب میں سیاسی نفوذ حاصل کر رکھا تھا۔ معاشرہ میں سود، زنا، شراب خوری جیسے جرائم پھیلے ہوئے تھے۔

مگر قرآن میں آپ کے اوپر پہلا حکم اترا تو وہ یہ نہیں تھا کہ طہر الکعبۃ من الاصنام یا قاتل الفرس والرومان، یا نفذ حدود اللہ علی المجرمین۔ اس کے برعکس آپ کے اوپر پہلا حکم جو اتارا گیا وہ قرأت اور تعلیم کے بارے میں تھا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی عمل (Islamic activism) کا صحیح نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ممکن سے آغاز کیا جائے۔ بعثت کے وقت جو حالات تھے اس کے اعتبار سے تطہیر مسجد، سیاسی استقلال، اور تنفیذ حدود کا کام، مطلوب ہونے کے باوجود، عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ البتہ تعلیم اور دعوت سے آغاز کرنا پوری طرح دائرہ امکان میں تھا۔ آپ نے، اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں ناممکن کو چھوڑ کر ممکن سے عمل اسلامی کا آغاز کیا۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ سیاست ممکن کا فن ہے (politics is the art of possible) میں کہوں گا کہ عمل اسلامی کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ ممکن سے آغاز کیا جائے:

Prophetic way of beginning is to begin from the possible.

عسر میں یسر

پیغمبر اسلام اور آپ کے ابتدائی اصحاب نے مکہ میں توحید کی دعوت دینا شروع کیا تو وہاں کے لوگوں کی طرف سے سخت ردعمل پیش آیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ مکہ کی سرزمین اسلام کے لیے صرف مشکلات و مصائب کی سرزمین ہے۔ اس وقت قرآن میں یہ رہنما آیت اتری کہ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے مشکل کے ساتھ آسانی ہے (فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا)

اس سے پیغمبر کے فاتحانہ طریقہ کار کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی بھی صرف مشکلوں کی آماجگاہ نہ بنے۔ یہاں ہمیشہ مشکل کے ساتھ عین اسی وقت آسانی بھی ضرور پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جہاں بظاہر ڈس ایڈوانٹج ہو وہیں عین اسی کے ساتھ ایڈوانٹج کی صورتیں بھی ضرور موجود ہو۔

'عسر میں یسر' کی مثال یہ ہے کہ مکہ میں اگر ابوجہل جیسے منکر تھے تو وہیں عمر جیسے اعتراف کرنے والے بھی موجود تھے۔ اس وقت اگر کعبہ سے بتوں کو نکالنا مشکل تھا تو عین اسی وقت یہ ممکن تھا کہ لوگوں کے دلوں سے غیر اللہ کی پرستش کا جذبہ نکالا جائے۔ اسی طرح دور اول میں اہل اسلام کو عرب میں جو مشکلیں پیش آئیں وہ چیلنج بن کر اہل اسلام کی صلاحیتوں کو جگانے کا سبب بن گئیں۔ یہاں تک کہ، مارگولیتھ کے الفاظ میں ——— ان میں کا ایک ایک شخص ہیرو بن گیا۔

سیرت کا یہ پہلو بتاتا ہے کہ اہل اسلام جب اپنے آپ کو مسائل کے درمیان پائیں تو ان کو پیشگی طور پر یقین کرنا چاہیے کہ یہاں عین مسائل کے ساتھ ہی مواقع بھی موجود ہیں۔ ان کو چاہیے کہ مسائل کے خلاف فریاد کرنے کے بجائے مواقع کو دریافت کریں اور ان کو استعمال کر کے اپنی تاریخ کو آگے بڑھائیں۔

ہجرت : مقام عمل کی تبدیلی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مکہ میں سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہاں کے مخالفین آپ کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت آپ نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔

یہ ہجرت سادہ طور پر ترک وطن نہ تھی۔ یہ دراصل ایک اسٹریٹجی کا معاملہ تھا۔ اس کو ایک لفظ میں مقام عمل کی تبدیلی کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے جب مکہ کو ایک ناموافق مقام پایا تو آپ نے مدینہ کو

اپنا مرکز بنالیا تاکہ وہاں سے اپنا مشن جاری رکھ سکیں۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ ایک جگہ کے لوگ اگر ضد اور مخالفت کی آخری حد پر آجائیں تو یہ صحیح نہ ہوگا کہ اہل اسلام وہیں ان سے لڑکر ہلاک ہوجائیں۔ بلکہ انھیں دوسری مناسب جگہ تلاش کرکے وہاں اپنا اسلامی عمل جاری کردینا چاہیے۔ یہ طریقہ ایک طرف اصل مشن کے زندہ رہنے کی ضمانت ہے، دوسری طرف اس میں یہ امکان بھی چھپا ہوا ہے کہ 'مدینہ' میں استحکام حاصل کرنے کے بعد 'مکہ' بھی آخر کار قبضہ میں آجائے۔

فطرت پر اعتماد

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو باربار یہ تجربہ ہو رہا تھا کہ لوگ آپ کے ساتھ برے طریقے سے پیش آتے ہیں۔ اشتعال انگیز کلمات کہنا، پتھر مارنا، راستہ میں رکاوٹ ڈالنا، وغیرہ۔ اس وقت قرآن میں حکم دیا گیا کہ تم برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ پھر تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے۔ (فصلت ۳۴)

اس ہدایت میں ایک اہم حقیقت بتائی گئی ہے وہ یہ کہ کوئی انسان بظاہر مخالف اور دشمن کیوں نہ ہو اس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت بہر حال موجود رہتی ہے۔

فطرت ہمیشہ حق پسند ہوتی ہے۔ اس طرح گویا ہر ظاہری دشمن کے اندر تمہارا ایک مخفی دوست موجود رہتا ہے۔ اگر تم حق کے داعی ہو تو پیشگی طور پر یہ یقین کرلو کہ تمہاری دعوت کا ایک مثنیٰ (counterpart) یقیناً فریق ثانی کے سینہ میں موجود ہوگا۔

مخالف انسان کے اندر اس موافق انسان کو پانے کی یقینی تدبیر یہ ہے کہ تم اس کے برے سلوک کے جواب میں اپنی طرف سے اچھا سلوک کرو۔ تمہارا اچھا سلوک اس کے ظاہری پردے کو ہٹادے گا۔ اور پھر اندر سے تمہارا ایک دوست انسان نکل آئے گا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دور اول میں ہزاروں لوگ صرف اسی اصول پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اسلام میں داخل ہوئے۔ مثلاً ایک مشرک نے آپ کو تنہا پاکر آپ کے اوپر تلوار اٹھائی۔ مگر اس پر قابو پانے کے بعد آپ نے اس کو معاف کردیا۔ اسی وقت اس نے اسلام قبول کرلیا۔ وغیرہ۔ دور اول میں اس طرح کے واقعات کثرت سے پیش آئے جن کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

دشمن کو استعمال کرنا

بدر کی جنگ کے بعد مخالف فوج کے ستّر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ یہ سب مکہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ان جنگی مجرموں میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو پڑھا دے گا وہ اس کا فدیہ ہو گا۔ اور اس کے بعد ہم اس کو رہا کر دیں گے۔ یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا اسکول تھا جو اس طرح قائم کیا گیا کہ اس کے طلبہ تو سب مسلمان تھے مگر اس کے ٹیچر سب کے سب دشمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

پیغمبر کی اس سنت سے یہ اصول ملتا ہے کہ اہل اسلام کی سوچ اتنی بلند ہونی چاہیے کہ وہ غیروں سے بھی مفید چیزیں سیکھیں۔ مقصد کے حصول میں وہ دشمن قوم کے افراد کو بھی استعمال کر سکیں۔

امن کی طاقت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں سب سے زیادہ جس طاقت کو استعمال کیا وہ یہی امن کی طاقت ہے۔ مثال کے طور پر جب مکہ فتح ہوا تو مکہ کے وہ مخالفین آپ کے پاس لائے گئے جنھوں نے آپ کو ستایا تھا، جنھوں نے آپ کو مکہ سے نکالا تھا۔ جنھوں نے آپ کے خلاف جنگی کارروائی کی تھی۔ اور آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی تھیں۔

یہ لوگ ثابت شدہ طور پر جنگی مجرم تھے۔ اور جنگی مجرم کے لیے یہ عام رواج تھا کہ فاتح اس کو قتل کر دیتا تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے ان کو ملامت کا کلمہ تک نہیں کہا۔ آپ نے سادہ طور پر اعلان فرمایا کہ جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو (اِذھبوا فانتم الطلقاءْ)

یہ تشدد کے بجائے امن کی طاقت کو استعمال کرنا تھا۔ یہ جسمانی تسخیر کے بجائے ضمیر اور قلب کو متاثر کر کے آدمی کو اپنے قابو میں لینا تھا۔ اس اعلیٰ اخلاقی روش کا نتیجہ، راوی کے الفاظ میں یہ ہوا کہ وہ لوگ حرم سے باہر اس طرح نکلے گویا کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں۔ اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے (فخرجوا کانما انشروا من القبور ودخلوا فی الاسلام)

تھرڈ آپشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان موجودہ اردن

میں ایک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں چند دن کے اندر بارہ اصحاب شہید ہو گئے۔ اس کے بعد خالد بن الولید کو اسلامی لشکر کا سردار بنایا گیا۔ انھوں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار ہے اور رومیوں کی تعداد دو لاکھ ہے۔ یہ فرق ناقابل عبور حد تک غیر متناسب (out of proportion) تھا۔ چنانچہ خالد بن الولید نے مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔

یہ لوگ جب واپس ہوکر مدینہ پہنچے تو مدینہ کے کچھ لوگوں نے ان کا استقبال یا فُرّار (اے بھاگنے والو) کہہ کر کیا۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لیسوا بالفرار ولکنھم الکرار ان شاء اللہ تعالیٰ (وہ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ دوبارہ اقدام کرنے والے ہیں)

مدینہ کے مذکورہ مسلمان دراصل ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیے صرف دو میں سے ایک کا آپشن (انتخاب) ہے۔ پہلا آپشن یہ کہ دشمن سے بہادرانہ طور پر لڑا جائے۔ اور دوسرا آپشن یہ کہ ہمت ہار کر بزدلانہ پسپائی اختیار کی جائے۔ چونکہ دوسرا آپشن غیر محمود تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ مسلم لشکر کو پہلے آپشن پر ہی قائم رہنا چاہیے تھا خواہ ان کا ایک ایک شخص لڑتے لڑتے اپنی جان دے دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر رہنمائی دیتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک تیسرا آپشن بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر مزید تیاری کی جائے تاکہ آئندہ زیادہ موثر انداز میں اقدام کیا جا سکے۔ خالد بن الولید کی موتہ سے واپسی فرار کی طرف واپسی نہیں تھی بلکہ وہ اسی تھرڈ آپشن کی طرف واپسی تھی۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم جماعت نے تین سال بعد مزید تیاری کے ساتھ اسامہ ابن زید کی سرداری میں دوبارہ رومی سرحد کی طرف اقدام کیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔

میدان عمل کی تبدیلی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے۔ مگر مکہ کے سردار اب بھی خاموش نہیں ہوئے۔ انھوں نے آپ کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ کئی بار دونوں طرف کی فوجوں میں ٹکراؤ ہوا۔ مگر جنگ کے ذریعہ آخری فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے وہ معاہدہ کر لیا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دراصل دونوں فریقوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کے

ذریعہ آپ نے فریق ثانی کے ساتھ میدان مقابلہ کو بدل دیا۔ اب تک دونوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں پیش آرہا تھا۔ اب دونوں کا مقابلہ نظریاتی میدان میں منتقل ہوگیا۔ اس معاہدہ کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان بڑے پیمانہ پر ملنا جلنا شروع ہوگیا۔ اس اختلاط کے دوران اسلام کی نظریاتی برتری اپنے آپ ثابت ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہوکر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اہل اسلام کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی اور فریق ثانی کی تعداد مسلسل گھٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ مزید جنگ کے بغیر محض عوامی طاقت سے اہل اسلام غالب آگئے۔

اس سنتِ رسولؐ کا مطلب یہ ہے کہ حریف سے ایک میدان میں مقابلہ اگر موثر نہ ہو رہا ہو تو مقابلہ کے میدان کو بدل کر اس کو اپنے موافق میدان میں لایا جائے جہاں اہل اسلام اپنی کوششوں کو زیادہ موثر بنا سکیں۔

تدریج کا اصول

صحیح البخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ قرآن جب اترنا شروع ہوا تو اس میں سب سے پہلے وہ آیتیں اتاری گئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ اس طرح (تقریباً ۱۵ سال بعد) جب لوگوں کے دل نرم ہو گئے تو اس کے بعد قرآن میں یہ حکم اترا کہ زنا چھوڑ دو اور شراب چھوڑو۔ اس کے بعد وہ کہتی ہیں کہ اگر قرآن میں یہ احکام شروع ہی میں اتار دیے جاتے تو عرب کہتے کہ ہم تو کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے، ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے (لاندع الزنا ابداً ولاندع الخمر ابداً)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کا نفاذ ہمیشہ ترتیب و تدریج کے اصول پر کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلے لوگوں کے دلوں میں اس کی آمادگی پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد عملی طور پر اس کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ کوڑے اور بندوق کے زور پر کبھی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ایک غیر تیار شدہ معاشرہ میں محض طاقت کے زور پر شریعت کے احکام کو نافذ کرنا چاہے تو یہ سنتِ رسولؐ کے خلاف ہوگا۔ اور سنتِ رسولؐ کی خلاف ورزی کر کے کوئی کامیابی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

آئیڈیلزم کے بجائے پریگمیٹزم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں آئیڈیلزم کو اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ مگر دوسروں سے معاملہ کرنے میں پریگمیٹک حل

(pragmatic solution) پر راضی ہو جاؤ۔ یہ آپ کی ایک اہم سنت ہے اور آپ کی پوری زندگی اس سنت کی مثال نظر آتی ہے۔

جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا، آپ نے اس میں یہ الفاظ لکھوائے : هذا ما صالح عليه محمد رسول الله ۔قریش کے نمائندہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو خدا کا رسول نہیں مانتے۔ اس لیے آپ محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبد اللہ لکھوائیے۔ آپ نے محسوس کیا کہ اگر میں رسول اللہ کے لفظ پر اصرار کروں تو صلح کا معاہدہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے آپ نے رسول اللہ کا لفظ کاغذ سے مٹا دیا اور اس کے بجائے محمد بن عبد اللہ لکھوا دیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو عظیم کامیابی حاصل کی اس میں اس سنت کا بڑا دخل ہے۔ یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بے شمار لوگ ہیں اور ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے یہاں عملی معاملات میں پریگمیٹزم کا اصول اختیار کیے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

پریگمیٹک سولیوشن یا عملی حل کو ماننا کوئی تنزل کی بات نہیں ہے۔ یہ حقیقت پسندی کی بات ہے، اور اس دنیا میں حقیقت پسندی ہی تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

بصیرت کی ضرورت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے نمونہ ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے نمونہ لینے کے لیے گہری سمجھ کی ضرورت ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہری سمجھ نہ ہو تو وہ بظاہر قرآن کا یا سنتِ رسول کا نام لے گا مگر حقیقۃً اس کے عمل کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ وہ بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ مثلاً ہم سیرت کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکہ میں رہے مگر آپ نے کبھی کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو نکال کر پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسی پیغمبر کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد آپ کے حکم سے کعبہ کے تمام بت نکال کر باہر پھینک دیے گئے۔ ایک طرف ہم آپ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ مکی دور کے

آخر میں آپ کے مخالفین آپ کے مکان کو تلوار لے کر گھیر لیتے ہیں اس وقت آپ خاموشی سے ہجرت کرکے مدینہ چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مخالفین احد کے موقع پر جب تلوار لے کر آتے ہیں تو آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اس طرح کے مختلف نمونے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کے نمونہ کو اپنانے کے لیے اس حکمت کو جاننا ضروری ہے کہ کون سا نمونہ کس موقع کے لیے ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ بصیرت نہ ہو تو بظاہر وہ سنتِ رسول پر عمل کرنے کا دعویٰ کرے گا۔ مگر حقیقۃً وہ سنتِ رسول سے آخری حد تک دور ہوگا۔

جو شخص سنت کو سمجھنے کی بصیرت سے محروم ہو اس کا حال یہ ہوگا کہ جس موقع پر صبر کی سنت درکار ہوگی وہاں وہ قتال کی آیت کا حوالہ دے گا۔ جن حالات میں دعوت کی سنت مطلوب ہوگی وہاں وہ جہاد کی سنت پر تقریر کرے گا۔ جہاں صلح کی سنت پر عمل کرنا چاہیے وہاں وہ جنگ کی سنت پر عمل کرنے کا نعرہ لگائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بلاشبہ بہترین نمونہ ہے۔ مگر یہ نمونہ انھیں لوگوں کے لیے نمونہ بنے گا جو اس معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہوں۔ جن میں یہ مزاج نہ ہو کہ وہ اپنی خواہش کے لیے سنتِ رسول میں نمونہ تلاش کریں۔ بلکہ سنت رسول کے نمونہ پر اپنی خواہش کو ڈھالیں۔ جو اپنے آپ کو سنت رسول کے سامنے جھکانے کا مزاج رکھتے ہوں جو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ رسول کو اپنی زندگی کا رہنما بنالیں۔

حدیبیہ منہاج

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی مشہور کتاب (The 100) کا تعارف غالباً مسلم دنیا میں سب سے پہلے الرسالہ (اکتوبر ۱۹۷۸) میں چھپا۔ اس میں امریکی مصنف نے تاریخ کے ایک سو انتہائی ممتاز آدمیوں کا انتخاب کیا ہے۔ اور ان پر مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے اپنی فہرست میں نمبر ایک پر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو رکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ محمدؐ تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب انسان (supremely successful man) تھے۔

الرسالہ میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہمارے پاس کثرت سے مسلمانوں کے خطوط آئے۔ ہر خط میں یہ پوچھا گیا تھا کہ مذکورہ کتاب کو حاصل کرنے کا پتہ کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے اردو ترجمہ کی بابت دریافت کیا۔ تاہم لوگوں کی تحریروں سے اندازہ ہوا کہ ہر مکتوب نگار کو صرف سپریملی سکس فل انسان سے دلچسپی تھی، ان میں سے کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہ تھی کہ وہ اس سپریملی سکس فل انسان کی سپریم سکس کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام مزاج ہے۔ اور اس مزاج کا سبب ہیرو ورشپ کی نفسیات ہے۔ موجودہ مسلمانوں نے رسول اور اصحاب رسول کو اپنا ہیرو بنایا ہے نہ کہ اپنا عملی نمونہ۔ یہ دراصل ان قوموں کی نفسیات ہے جو خود کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔ ایسے لوگ اپنی تاریخی شخصیتوں کے پر عظمت تذکرہ کو اپنے لئے تسکین کا سامان بنا لیتے ہیں۔ کسی نے نہایت صحیح کہا ہے کہ تاریخ ان لوگوں کی پناہ گاہ ہے جنھوں نے خود کچھ زیادہ نہ کیا ہو جس کی وہ تقریب منائیں:

History is often the refuge of those who have not done much themselves to celebrate.

امت مسلمہ جب زندہ حالت میں ہو تو اس کا پیغمبر اس کے لئے نمونۂ عمل ہوتا ہے۔ اور امت مسلمہ کے لوگ جب زندہ حالت پر باقی نہ رہیں تو وہ اپنے پیغمبر کو اپنے لئے فخر کا نشان بنا لیتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسی دوسری حالت میں مبتلا ہیں۔

موجودہ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لئے فخر کا نشان بنالیا ہے۔ اور فخر کے جذبہ کی تسکین اسی طرح ہوتی ہے کہ آپ کو سپر یملی سکس فل کہا جائے۔ قرآن میں پیغمبر اسلام کو اسوہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے نہ کہ فخر کے طور پر۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب ۲۱) مگر موجودہ مسلمانوں نے اپنی تشریح میں اس کو بدل کر لقد کان لکم فی رسول اللہ مفخرۃ حسنۃ بنادیا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق، ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سپریم سکس کا راز کیا تھا۔ کیوں کہ اس راز کو جان کر ہی ہم دوبارہ اسلام کو اعلیٰ کامیابی کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں۔

اس سوال کو لے کر جب ہم قرآن میں غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے قرآن کی وہ سورہ آتی ہے جس کا نام الفتح ہے۔ اس سورہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ہم نے تم کو کھلی فتح دیدی (انا فتحنا لك فتحا مبينا) ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے جس چیز کو سپریم سکس بتایا ہے، اس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فتح مبین یا سپریم سکس کس طرح حاصل ہوئی۔ قرآن کی مذکورہ آیت بتاتی ہے کہ آپ کو یہ غیر معمولی فتح صلح حدیبیہ کے ذریعہ اور اس کے بعد حاصل ہوئی۔ قرآن کی مذکورہ آیت صلح حدیبیہ ہی کے بارہ میں اتری تھی۔ اس لئے یہاں بطریق نص یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس فتح کا راز وہ مخصوص طریقہ تھا جس کا استعمال حدیبیہ کے واقعہ میں کیا گیا۔ اس کو ہم حدیبیہ منہاج کہہ سکتے ہیں۔

حدیبیہ سے بظاہر آپ اپنے مقصد کو حاصل کئے بغیر واپس آئے تھے۔ چنانچہ حدیبیہ سے مدینہ واپس جاتے ہوئے راستہ میں جب سورہ فتح نازل ہوئی تو ایک شخص نے کہا کہ یہ تو کوئی فتح نہیں۔ انھوں نے ہم کو بیت اللہ میں داخلہ سے روک دیا۔ آپ نے فرمایا۔ بلکہ وہ تمام فتحوں میں سب سے بڑی فتح ہے (قال رجل عند مُنصَرفِہم. ما ھٰذا بفتح۔ لقد صدونا عن البیت۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بل ھو اعظم الفتوح)

الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۲۶۰

البراء بن عازب صحابی نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو۔ مگر ہم لوگ (اصحاب رسول) حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے۔ ابن شہاب زہری تابعی نے کہا کہ اسلام میں صلح حدیبیہ کو فتح اعظم کا درجہ حاصل ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، ۳/۳۲۴)

یہ جو کچھ کہا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کو جو عظیم کامیابی ملی، اس کا راز صلح حدیبیہ تھا۔ اسلام کا قافلہ حدیبیہ سے گزر کر فتح اعظم کے درجہ کو پہنچا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اہل اسلام کے لئے فتح اعظم یا سپریم سکسس کے مقام تک پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ وہ حدیبیہ منہاج کو اختیار کریں۔

اب غور کیجئے کہ حدیبیہ منہاج کیا ہے۔ یہ تمام قربانیوں میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اصحاب رسول جیسے فداکاروں کا گروہ بھی اس معاملہ میں وقتی طور پر متزلزل ہوگیا اور نہایت دشواریوں کے ساتھ اس امتحان میں پورا اتر سکا۔

اصحاب رسول کے سامنے بدر اور احد کے محاذ آئے جس میں انھیں اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اصحاب رسول کسی سستی اور تذبذب کے بغیر اس میدان میں کود پڑے۔ انھوں نے خون بہا کر اپنی جاں بازی اور قربانی کا ثبوت دیا۔

دوسری طرف تاریخ بتاتی ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کا معاہدہ کر لیا اور عمرہ کئے بغیر مدینہ کی طرف واپس جانے پر راضی ہوگئے تو ایک ابوبکر صدیق کو چھوڑ کر تمام اصحاب رسول نے اس پر اپنی عدم رضامندی کا اظہار کیا۔ کوئی بھی اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید اصرار اور دباؤ کے تحت آخر کار وہ اس پر راضی ہوئے۔

یہاں سوچنے کی بات ہے کہ بدر و احد میں اور حدیبیہ میں کیا فرق ہے کہ اصحاب رسول جیسا سرفروش گروہ بدر و احد کی قربانی کے لئے بخوشی راضی ہوگیا مگر حدیبیہ کی قربانی پر راضی ہونا اس کے لئے سخت مشکل بن گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بدر و احد کے محاذ پر جان کی قربانی دینا تھا، اور حدیبیہ کے محاذ پر وقار کی قربانی دینے کا مسئلہ تھا۔ اور ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کے لئے

جان کی قربانی اتنی آسان ہے کہ ساری معلوم تاریخ میں بے شمار لوگ مسلسل جان کی قربانی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن وقار کی قربانی اتنی زیادہ مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں چند اللہ کے بندوں کے سوا کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا جو واقعی رضامندی کے ساتھ وقار کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جان کی قربانی میں آدمی ہیرو بن رہا ہوتا ہے جب کہ وقار کی قربانی میں وہ اچانک زیرو بن جاتا ہے۔ جان کی قربانی میں وہ اپنے آپ کو فتح کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے اور وقار کی قربانی میں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے خود اپنے فیصلہ سے شکست کو قبول کر لیا۔ جان کی قربانی بظاہر ایک عزت کا عمل ہے اور وقار کی قربانی اس کے برعکس بے عزتی کا عمل۔ جان کی قربانی میں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور وقار کی قربانی میں پیچھے ہٹ جانا۔ جان کی قربانی میں اقدام کا سہرا بندھتا ہے اور وقار کی قربانی میں پسپائی کا الزام سہنا پڑتا ہے —— یہی وجہ ہے کہ جان کی قربانی چھوٹی قربانی ہے اور وقار کی قربانی زیادہ بڑی قربانی۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ جتنی بڑی قربانی اتنی ہی بڑی کامیابی۔ سب سے بڑی کامیابی کسی کو صرف اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ سب سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔ رسول اور اصحاب رسول نے چوں کہ حدیبیہ کے موقع پر سب سے بڑی قربانی دی اسی لئے وہ اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی کے مستحق قرار پائے۔

حدیبیہ منہاج میں وہ کون سی خصوصی طاقت ہے جس کی بنا پر وہ فتح مبین کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس کا سراغ اس واقعہ میں ملتا ہے کہ ذوالقعدہ ۶ ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کا سفر فرمایا، اس وقت آپ کے ساتھ جو مردان کار تھے، ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی کم تھی۔ مگر اس کے دو سال سے بھی کم عرصہ بعد رمضان ۸ ھ میں جب آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف مارچ کیا تو آپ کے ساتھ مردان کار کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ پہلے سفر میں اہل مکہ نے آپ کو حدیبیہ کے مقام سے لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے سفر میں آپ کے عظیم قافلہ کو دیکھ کر وہ اتنا مرعوب ہوئے کہ مقابلہ کے بغیر انھوں نے شکست قبول کر لی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیبیہ منہاج انسانی تسخیر کا منہاج ہے۔ حربی منہاج میں انسانوں

کے جسم کو قتل کیا جاتا ہے۔ اور حدیبیہ منہاج میں انسانوں کی روح کو مسخر کیا جاتا ہے۔ جنگ کا منہاج یہ ہے کہ دشمن کا خاتمہ کرکے اس کے اوپر قبضہ کیا جائے۔ حدیبیہ منہاج یہ ہے کہ دشمن کو دوست بنا کر اس کو اپنی صف میں شامل کر لیا جائے۔ جنگ کے منہاج میں صاحب منہاج کا ہاتھ لوگوں کی گردن پر ہوتا ہے اور حدیبیہ کے منہاج میں صاحب منہاج کا ہاتھ لوگوں کے قلوب پر۔ جنگ کا منہاج دوسروں کو مٹا کر اپنا غلبہ قائم کرنا ہے اور حدیبیہ کا منہاج لوگوں کو شریک کرکے حق کو سربلند کرنا ہے۔ جنگ کا منہاج اگر صرف میں کا نام ہے تو حدیبیہ منہاج میں اور آپ دونوں کا نام۔ جنگ کے منہاج میں نفرت کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے اور حدیبیہ کے منہاج میں محبت کامیابی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔

حدیبیہ کا واقعہ نبوت کے تقریباً ۲۰ سال بعد پیش آیا۔ غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ حدیبیہ منہاج کے اس پہلو پر غور کیا جائے تو اس سے ایک اور عظیم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

اس معاملہ کا سراغ سورہ الفتح کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس میں اصحاب رسول کو مخاطب کرکے بتایا گیا ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر جب قریش کے سرداروں نے سرکشی کا مظاہرہ کیا تو یہ ممکن تھا کہ تم کو جنگ کی اجازت دیدی جائے اور اللہ کی مدد سے تمھیں فتح بھی حاصل ہو۔ مگر ایک خاص مصلحت کی وجہ سے تم کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔

وہ مصلحت یہ تھی کہ مکہ میں اس وقت بہت سے مرد اور عورت تھے جن کے دل میں اسلام داخل ہو چکا تھا۔ مگر انھوں نے چوں کہ ابھی اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا، اس لئے تم ان کو نہیں جانتے تھے۔ گویا کہ امکانی طور پر وہ مسلمان تھے۔ اگر دونوں فریقوں میں جنگ چھڑتی تو یہ لوگ بھی اس میں مارے جاتے۔ تم لاعلمی میں اہل انکار کے ساتھ اہل اقرار کو بھی پیس ڈالتے۔ اور بلاشبہ یہ بہت بڑا نقصان ہوتا۔ (الفتح ۲۲-۲۵)

پھر فرمایا کہ اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی (فعلم مالم تعلموا) اس علم کی بنا پر حدیبیہ کے موقع پر یہ ہدایت دی گئی کہ یک طرفہ شرط ماننا ہو تب بھی اس کو مان کر سرداران مکہ سے صلح کر لو۔ تاکہ ان امکانی مسلمانوں کو یہ موقع مل جائے کہ وہ اپنے پوشیدہ ایمان کا اعلان

کر کے اسلام کی صفوں میں داخل ہو جائیں۔

اس صورت حال کا پس منظر یہ ہے کہ عرب کے لوگ (بنو اسماعیل) عموماً سادہ مزاج تھے اور اپنی فطرت پر قائم تھے۔ ان کا شرک اوپری قسم کا تھا، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ ان کے اندر سرایت نہیں کر سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے۔ وہ سادہ قسم کے سوالات کرتا ہے اور اس کے بعد یا تو آپ کی صداقت کا اعتراف کر لیتا ہے یا اسی وقت کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔

مثلاً عمرو بن عبسہ ایک صحابی ہیں۔ وہ اولاً مکہ میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ اور آپ سے کہا کہ جو کچھ اللہ نے آپ کو بتایا ہے اس میں سے مجھے بتائیے (عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ) آپ انھیں توحید، صلہ رحمی اور حسن اخلاق کی باتیں بتاتے ہیں۔ وہ فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ کتنی اچھی یہ باتیں ہیں جن کے ساتھ اللہ نے آپ کو بھیجا ہے (نعم ما ارسلك اللّٰه به) حیاۃ الصحابہ ۱/۷۲

اس طرح کے واقعات کثرت سے سیرت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عربوں کا بگاڑ اوپری نوعیت کا تھا۔ ان کی اصل شخصیت فطری حالت پر قائم تھی اور معمولی تحریک سے حق کو پہچان لیتی تھی۔

قدیم عربوں کی اسی سادگی کا نتیجہ تھا کہ ان کے چند سرداروں کو چھوڑ کر عام عربوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار زیادہ تر غلط فہمی کی بنا پر تھا نہ کہ حقیقۃً سرکشی کی بنا پر۔ اپنے اسی مزاج کی بنا پر انھیں یہ جرأت ہوئی کہ بدر کی جنگ سے پہلے وہ دعا کریں جس کا ذکر سورہ انفال میں کیا گیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ کے لوگ جب ایک ہزار کی تعداد میں مکہ سے نکل کر بدر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ رسول اور اصحاب رسول سے جنگ کریں تو وہ بیت اللہ میں گئے۔ اور کعبہ کے پردے کو پکڑ کر دعائیں کیں۔ اس دعا میں انھوں نے کہا کہ اے اللہ دونوں گروہوں میں سے جو گروہ زیادہ ہدایت پر ہو اور دونوں دینوں میں سے جو دین زیادہ

افضل ہو، تو اس کی مدد فرما اور اس کو فتح دے (انہم لما نفروا الی نصرة العیر تعلقوا باستار الکعبة وقالوا: اللّٰہم انصر اھدی الطائفتین و افضل الدینین) الجامع لاحکام القرآن ۷/۳۸۶

اس کے بعد جب دونوں فریقوں میں ٹکراؤ ہوا تو اہل ایمان کو فتح اور اہل شرک کو شکست ہوئی۔ چنانچہ قرآن میں اہل مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے۔ تو فیصلہ تمہارے سامنے آگیا اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (الانفال ۱۹)

جنگ بدر کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو یوم الفرقان (الانفال ۴۱) کہا گیا ہے۔

جنگ بدر میں واضح فیصلہ آنے کے بعد عرب کے لوگ، تھوڑے سے سرداروں کو چھوڑ کر، سخت متزلزل ہو گئے۔ ان کا یہ خیال ہو گیا کہ صداقت ہماری طرف نہیں ہے بلکہ محمدؐ کی طرف ہے۔ اس طرح بدر کے بعد عربوں کی اکثریت دین توحید کی طرف مائل ہو گئی۔ تاہم کچھ جابر اور سرکش سرداروں کے خوف سے ہر ایک اپنے ایمان کو چھپائے رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم عرب (بنو اسماعیل) اپنی سادگی اور اپنے فطری مزاج کی بنا پر اول روز ہی سے امکانی طور پر مومن تھے۔ اس کے بعد بدر کے موقع پر خدا سے استفتاح جب الٹی شکل میں برآمد ہوا تو ان کا ابتدائی میلان زیادہ طاقتور رجحان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ امکانی طور پر اسلام کے دروازہ پر پہنچ گئے۔

اب مسئلہ صرف ایک تھا، اور وہ سرداران قریش کا تھا۔ وہ اپنی قیادت اور برتری کو قائم رکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ چھیڑے ہوئے تھے اور بظاہر اس پر راضی نہ تھے کہ آپ کا اور آپ کے موحدانہ مشن کا خاتمہ کئے بغیر وہ اپنی جنگ جوئی کو ختم کر دیں۔ انھیں سرکش سرداروں کے خوف سے مکہ اور اطراف مکہ کے لوگ اسلام قبول کرنے سے گھبراتے تھے۔

کسی ندی میں پانی بہہ کر آئے اور بیراج کے آہنی گیٹ پر رک جائے۔ اب ایک طرف پانی کے ذخائر ہیں اور دوسری طرف کھیت اور باغات۔ ایسی حالت میں اگر روک دروازہ کو ہٹا دیا جائے تو پانی کا سیلاب اپنے آپ بہہ کر کھیتوں اور باغوں میں پہنچ جائے گا۔ اس کے

بعد اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ پانی کے ذخیرہ کو دھکا دے کر آگے بڑھایا جائے۔

اس وقت قریش کی جنگ جوئی اسی قسم کے ایک روک دروازہ (trap door) جیسی ہوگئی تھی۔ مسئلہ صرف درمیانی روک کو ہٹانے کا تھا۔ روک کے ہٹنے کے بعد یقینی تھا کہ ہدایت کا سیلاب اپنے آپ یلغار کر کے لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جائے گا۔

قریش سے جنگ جاری رکھنے کے لئے خون کی قربانی درکار تھی۔ اور جنگ کی صورت حال کو ختم کرنے کے لئے وقار کی قربانی کا مسئلہ تھا۔ کیوں کہ جنگ دوطرفہ بنیاد پر ہرگز ختم نہیں ہوسکتی جنگ کو ختم کرنے کی واحد صورت یہ تھی کہ اس کو وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے اور یک طرفہ طور پر اپنے وقار کی قربانی دے کر قریش مکہ سے صلح کر لی جائے۔ صلح حدیبیہ اسی قسم کا ایک دوررس معاملہ ہے۔

حدیبیہ منہاج یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے جب رکاوٹ ختم نہ کی جارہی ہو تو داعی یک طرفہ جھکاؤ کے ذریعہ اپنی طرف سے رکاوٹ کا خاتمہ کر دے۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسلمان اپنے سینہ میں یہ غم لئے ہوئے تھے کہ مکہ کے سرداروں نے ان کو ان کے وطن سے نکالا۔ ان کے گھروں اور جائدادوں پر قبضہ کیا۔ لڑائیاں چھیڑ کر ان کی عورتوں کو بیوہ اور ان کے بچوں کو یتیم کیا۔ مکہ جا کر عمرہ کرنے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس قسم کے واقعات انھیں اس پر اکسا رہے تھے کہ قریش سے لڑ کر انتقام لیں اور انھیں ان کے کئے کا سبق دیں۔

دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اگر مسلمان اپنے غموں اور شکایتوں کو بھلا دیں اور اپنے شکایتی جذبات کو دبا کر یک طرفہ طور پر خاتمۂ جنگ کے لئے راضی ہو جائیں تو اس کے بعد معتدل فضا پیدا ہو جائے گی۔ معتدل فضا پیدا ہونے کے بعد اسلام کے تعارف کا کام تیزی سے بڑھ جائے گا۔ لوگ جو پہلے ہی سے اسلام کے قریب آچکے ہیں، حالات کی موافقت انھیں تیزی سے اسلام کی طرف لانا شروع کر دے گی۔

قتال نام ہے خون کی قربانی دے کر اسلام کا دفاع کرنے کا۔ حدیبیہ نام ہے وقار کی قربانی دے کر خدا کے بندوں کے لئے خدا کے دین کا دروازہ کھولنے کا۔ یہی فرق

یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ثانی الذکر قربانی اول الذکر قربانی سے زیادہ عظیم ہے۔

مسلم نے ابو ہریرہؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے پسند ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ میرے اصحاب ہو۔ ہمارے اخوان وہ لوگ ہیں جو ابھی نہیں آئے (وَدِدتُ أنّا قد رأينا اخوانَنا۔ قالوا أولسنا اخوانك يا رسول الله۔ قال انتم اصحابي و اخواننا الذين لم يأتوا بعدُ)

الدارمی نے روایت کیا ہے کہ ابو عبیدہ بن الجراح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا امت میں کوئی ہم سے بہتر ہے۔ ہم آپ پر ایمان لائے۔ اور آپ کے ساتھ جہاد کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ وہ لوگ جو میرے اوپر ایمان رکھیں اور انھوں نے مجھ کو دیکھا نہ ہوگا (قلت يا رسول الله احد خير منا۔ آمنّا بك وجاهدنا معك۔ قال نعم قوم يؤمنون بي ولم يَرَوني) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۹/۲۰۶ - ۲۰۷

اس حدیث میں لَم یَرَوْنِی محض لفظی معنوں میں نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ایک ایسا پیغمبر جو بعد کے زمانہ میں تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت بننے والا ہو، جس کی عظمت مسلّمہ عظمت کا درجہ حاصل کرنے والی ہو، اس کو ماننا کوئی امتیازی خصوصیت کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کو کسی معنوی مفہوم میں لیا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس پیغمبر کی منشا کو دور اول کے اصحاب رسول نے براہ راست طور پر پیغمبر کو دیکھ کر اور اس سے سن کر مانا تھا، اس پیغمبر کی منشا کو بعد کے اخوان رسول دیکھے اور سنے بغیر ذاتی دریافت کے ذریعہ معلوم کریں گے۔ اس معاملہ کی وضاحت ایک مثال سے بخوبی ہوتی ہے۔

اصحاب رسول کے سامنے بدر اور احد کا محاذ آیا۔ یہ محاذ جان کی قربانی کا طالب تھا۔ اصحاب رسول نے بلا تأمل یہ قربانی پیش کر دی۔ پیغمبر کا اشارہ پاتے ہی وہ بدر و احد کے میدان جہاد میں کود پڑے۔ پھر کسی کو اللہ نے شہادت دی، اور کوئی اس سے غازی بن کر واپس آیا۔

انھیں اصحاب رسول کے سامنے دوسرا محاذ وہ آیا جس کو ارباب سیر "غزوۃ الحدیبیۃ" کہتے ہیں۔ یہ دوسرا محاذ بھی قربانی کا محاذ تھا۔ البتہ ظاہری طور پر دونوں میں فرق تھا۔ اس دوسرے محاذ پر صرف ایک ابو بکر صدیق کو چھوڑ کر تمام کے تمام صحابہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہی لوگ جنھوں نے پہلے محاذ پر یقین کا مظاہرہ کیا تھا، اس دوسرے محاذ پر شدید تر دد میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبر کے ذاتی اور شخصی زور پر انھوں نے اس کو قبول کیا۔

آج یہی تاریخ دوبارہ مسلمانوں کی طرف لوٹ آئی ہے۔ آج ایک طرف ساری دنیا میں ایسی روحیں موجود ہیں جو بظاہر غیر مسلم ماحول میں ہیں۔ مگر ان کی فطرت دین حق کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے درمیان ساری دنیا میں نزاع اور ٹکراؤ جاری ہے۔ اس نزاع اور ٹکراؤ نے اس معتدل فضا کا خاتمہ کر دیا ہے جس میں مذکورہ قسم کے غیر مسلم کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھیں اور اس کو قبول کریں۔

اب آج مسلمانوں کو دوبارہ وہی قربانی دینا ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت اصحاب رسول نے دی تھی۔ ان کو ذاتی شکایتوں کو بھلا دینا پڑا تھا۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ذاتی اور قومی شکایتوں کو بھلا دیں تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہو سکیں۔

صحابہ کرام نے رسول اللہ کو دیکھ کر اور آپ کی براہ راست ذاتی ہدایت پر صبر کی قربانی دی تھی۔ آج مسلمانوں کو رسول اللہ کو دیکھے بغیر صرف آپ کی سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے یہی صبر والی قربانی دینا ہے۔ آج کے مسلمان اگر یہ قربانی دے سکیں تو وہ مذکورہ حدیث کے مطابق اخوان رسول قرار پائیں گے، اور بلاشبہ کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے دن اس کا استقبال اخوان رسول کی حیثیت سے کیا جائے۔

جنگ پر بیعت نہیں

امن ایک ایجابی اہمیت کی چیز ہے۔ جبکہ جنگ کی کوئی ایجابی اہمیت نہیں۔ جنگ تمام تر ایک سلبی نوعیت کی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ امن انسانی معاشرہ کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ جنگ صرف وقتی طور پر بطور دفاع مطلوب ہو سکتی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ صرف اس وقت جب کہ امن کی برقراری کی ہر ممکن تدبیر ناکام ہو چکی ہو۔ اور مقابلہ کے سوا کوئی اور صورت سرے سے باقی ہی نہ رہے۔

امن وجنگ کا یہ فرق اتنا قطعی ہے کہ ہر مذہب میں اس کو مستقل اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں کسی مذہب کا کوئی استثناء نہیں۔ اسلام جو ایک غیر محرف مذہب ہے، اس میں بھی امن وجنگ کے بارہ میں یہی تصور پایا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوا۔

چنانچہ قرآن میں الصلح خیر (صلح بہتر ہے) کی آیت نازل ہوئی۔ مگر قرآن میں کہیں بھی الحرب خیر (جنگ بہتر ہے) کے مفہوم کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اسی طرح لا تتمنوا لقاء العدو و اسألو اللہ العافیۃ کی حدیث موجود ہے۔ مگر اس کے برعکس اس مفہوم کی کوئی حدیث موجود نہیں کہ لوگو دشمن سے جنگ کے متمنی بنو اور اللہ سے حرب وضرب کی دعا کرو۔

یہ بات قرآن وحدیث میں نہایت واضح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ ظاہر ہوا ہے جو اپنے آپ کو اسلام پسند کہتا ہے مگر زیادہ صحیح طور پر اس کا نام جنگ پسند ہونا چاہئے کیوں کہ انھیں جنگ کی باتیں کرنا بہت پسند ہے۔ انھوں نے اقبال کو اپنا ہیرو بنایا ہے جس نے شاعرانہ تخیّل کے تحت کہا تھا:

خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الّا اللہ

اگرچہ اپنی ذات کے لئے یہ لوگ بھی پوری طرح امن پسند ہیں۔ ان کا اصول ہے: جنگ نہ کرو البتہ جنگ کی باتیں خوب کرو۔ وہ خود اپنی ایک انگلی بھی کٹانا نہیں چاہتے مگر اپنی تقریر وتحریر میں سر کٹانے کو خوب گلوریفائی کرتے ہیں۔ اپنی اس دوعملی کے نتیجہ میں وہ خود تو ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ البتہ سادہ لوح مسلمان ان کی باتوں سے متاثر ہو کر مارے جاتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ اسلام کی امن پسندی کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ مگر ان جنگ پسند حضرات نے صلح حدیبیہ میں بھی جنگ کا اصول دریافت کرلیا ہے۔ وہ بیعت الرضوان کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ دیکھو صلح حدیبیہ بھی جنگ کے منصوبہ سے خالی نہیں۔ مگر یہ حوالہ نہایت غلط اور بے بنیاد ہے۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت الرضوان جنگ کی بیعت نہیں تھی، بلکہ عدم فرار کی بیعت تھی۔ یہ بیعت حدیبیہ کے سفر میں پیش آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے سفر کے لئے نکلے تو اس وقت آپ نے اعلان فرمایا تھا کہ ہم جنگ کے لئے نہیں جارہے ہیں بلکہ عمرہ کے لئے جارہے ہیں۔ حدیبیہ کے قیام میں بھی آپ نے بتکرار یہ واضح فرمایا کہ ہمارا مقصد ہرگز جنگ نہیں ہے۔ بلکہ صرف زیارت کعبہ ہے۔ ایسی حالت میں حدیبیہ پہنچ کر جنگ کی بیعت لینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بیعت الرضوان کی حقیقت کیا تھی۔ اس کے سلسلہ میں اس کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کرنا ہوگا۔

بیعت الرضوان (۶ ھ) اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جو حدیبیہ کے ضمن میں پیش آیا۔ یہ سفر اصلاً عمرہ کرنے کے لئے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس وقت قریش سے آپ کی صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران آپ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ وہ اہل مکہ کو بتائیں کہ آپ مکہ میں صرف عبادت کے لئے داخل ہونا چاہتے ہیں نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کے لئے۔

قریش اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کو اپنے یہاں روک لیا۔ جب آپ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مشہور ہوگیا کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کردیا ہے۔ یہ خبر بے حد غیر معمولی تھی۔ چنانچہ اس کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چودہ سو اصحاب کو جمع کیا اور ان سے بیعت لی اسی کا نام بیعت الرضوان ہے۔

یہ بیعت کس بات پر تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت پر بیعت لی ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ، جو خود اس بیعت میں شریک تھے، انھوں نے

تردید کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی۔ بلکہ اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں (ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یبایعنا علی الموت ولکن بایعنا علیٰ ان لا نفرّ) البدایہ والنھایہ ۴/۱۶۸

تمام سیرت نگاروں نے بیعت الرضوان کا یہی مفہوم لیا ہے۔ الفاظ اور سیاق کے مطابق اس کا کوئی اور مفہوم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب زاد المعاد میں بیعت الرضوان کے تذکرہ کے تحت یہ الفاظ لکھے ہیں: فبایعوہ علیٰ ان لا یفروا۔

روایات میں آتا ہے کہ اس کے بعد قریش مکہ نے سہیل بن عمرو کو اپنا سفیر بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ سہیل بن عمرو ایک اعتدال پسند آدمی تھے اور بعد کو انھوں نے اسلام بھی قبول کرلیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سہیل کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ مطمئن ہوگئے اور فرمایا کہ قریش نے جب سہیل کو گفت و شنید کے لئے بھیجا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صلح چاہتے ہیں۔

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ ٹکراؤ کے ہر موقع سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے رہے۔ مثلاً دوران سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ قریش کا ۲۰۰ سواروں کا دستہ مکہ سے روانہ ہوکر آپ کی طرف آرہا ہے۔ آپ کو جب اس کی خبر ملی تو آپ نے اصحاب سے یہ نہیں فرمایا کہ جنگ کرنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ بلکہ آپ نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس طرح قریش کی فوج سے ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اپنی جماعت کے سب سے زیادہ نرم مزاج آدمی کو اس سفارت کے ساتھ بھیجا کہ ہم صلح کرنے کے لئے تیار ہیں۔ پھر جب قتل کی خبر ملی اس وقت بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ خبر ملتے ہی قریش کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ بلکہ اپنے مقام پر ٹھہر کر لوگوں سے صرف اس بات کی بیعت لی کہ ہم یہیں جمے رہیں گے۔ قریش اگر خود سے لڑنے کے لئے آتے ہیں تو مقابلہ کریں گے۔ اور اگر وہ صلح پر راضی ہوتے ہیں تو صلح کرلیں گے۔ خواہ یہ صلح یکطرفہ شرطوں پر کیوں نہ ہو، جیسا کہ آپ نے عملاً کیا۔ بیعت الرضوان کے باوجود صلح کرلینا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت اصلاً جنگ کے لئے نہ تھی۔

اگر وہ جنگ کے لئے ہوتی تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد آپ اپنے دشمن سے یکطرفہ شرطوں پر صلح کریں۔

حضرت عثمان بن عفان جب مکہ گئے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے وہاں گئے تھے۔ بین اقوامی رواج کے مطابق، سفیر کا قتل اعلانِ جنگ کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب یہ خبر ملی کہ قریش نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا ہے تو فطری طور پر آپ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قریش اب آخری طور پر آمادۂ جنگ ہو چکے ہیں، وہ کسی حال میں صلح اور امن کا معاملہ کرنے پر راضی نہیں ہیں۔ اس خبر نے وقتی طور پر صورت حال کو یکسر بدل دیا۔

ابتدائی صورت حال کے مطابق، آپ کے سامنے صلح یا جنگ میں انتخاب (چوائس) کا مسئلہ تھا۔ اس وقت آپ نے جنگ کو چھوڑ کر صلح کا انتخاب فرمایا تھا۔ مگر قتلِ سفیر کی خبر نے ظاہر کیا کہ اب فرار یا جنگ میں سے کسی ایک صورت کے انتخاب (چوائس) کا مسئلہ درپیش ہے۔ یعنی قریش کسی حال میں بھی صلح پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہر حال میں جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے عدم فرار اور بصورتِ جارحیت دفاع کی بیعت لی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی تو پھر دوبارہ آپ جنگ کو چھوڑ کر صلح پر راضی ہو گئے۔ حالاں کہ یہ صلح آپ کو دشمن کی یکطرفہ شرطوں پر کرنی پڑی۔

بیعت الرضوان کا پیغام یہ ہے کہ تمہارے لئے اگر انتخاب (چوائس) فرار اور جنگ کے درمیان ہو تو فرار کو چھوڑ کر جنگ کا طریقہ اختیار کرو۔ اور اگر تمہارے لئے انتخاب (choice) صلح اور جنگ کے درمیان ہو تو جنگ کو چھوڑ کر صلح کا طریقہ اختیار کرو، خواہ یہ صلح فریق ثانی کی یکطرفہ شرائط پر ہی کیوں نہ ہو۔ مزید یہ کہ فرار کے مقابلہ میں عدم فرار کو اختیار کرنے کا حکم بھی مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ کیوں کہ حدیبیہ (۶ھ) میں آپ نے فرار کے مقابلہ میں عدمِ فرار کا فیصلہ فرمایا۔ مگر اس سے پہلے مکہ (۱ھ) میں اسی طرح کی صورتحال میں آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی۔

صبر کی اہمیت

حدیبیہ دراصل عدم ٹکراؤ کی پالیسی کا دوسرا نام ہے۔ اسی پالیسی کا نام صبر ہے۔ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو صبر سے زیادہ بہتر اور کشادہ عطیہ نہیں دیا گیا (وما أُعطی احد عطاءً خیراً واوسع من الصبر) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۳۹۲/۳

صبرکی اہمیت اور افضلیت کے بارہ میں اس قسم کے بہت سے اقوال رسول حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر مسند احمد میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے صبر سے زیادہ کشادہ رزق اور کوئی نہیں پاتا (وما اجد لکم رزقا أوسع من الصبر)

ان حدیثوں میں صبر کو رزق اور عطیہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر کوئی سلبی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایجابی چیز ہے۔ صبر محرومی نہیں ہے بلکہ یافت ہے۔ صبر بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر پیغمبرانہ عمل (prophetic activism) یا اسلامی عمل (Islamic activism) کی اصل بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریق کار تمام تر صبر کے اصول پر مبنی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قرآن دیا گیا وہ پورا کا پورا کتاب صبر ہے۔ جن آیتوں میں صبر کی براہ راست تعلیم دی گئی ہے، ان کا صبر کی آیت ہونا واضح ہے۔ لیکن غور کیجئے تو بقیہ قرآنی آیتیں بھی بالواسطہ طور پر صبر ہی کی آیتیں ہیں۔ مثلاً اقرأ باسم ربک الذی عین صبر کی آیت ہے۔ کیوں کہ ماحول کی اشتعال انگیزیوں پر صبر کے بغیر اقرأ کا عمل نہیں کیا جا سکتا۔ الحمد للہ رب العالمین میں صبر کا لفظ نہیں مگر وہ عین صبر کی آیت ہے۔ کیوں کہ نقصان اور محرومی پر جب تک صبر نہ کیا جائے حقیقی کلمۂ حمد آدمی کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ فقولا لہ قولاً لینا (طٰہٰ ۴۴) صبر کی آیت ہے۔ کیوں کہ سرکش مخاطب کی دل آزار باتوں کو جب تک برداشت نہ کیا جائے اس سے نرم انداز میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ ممکن سے اپنے عمل کا آغاز کیا جائے، اور ناکامی کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت کو ناممکن کے حصول میں لگا دیا جائے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تشددانہ طریق کار آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور پرامن طریق کار کامیابی کی طرف۔ تشددانہ طریق کار ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پرامن طریق کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو نزاعی معاملات میں صبر وتحمل کا ثبوت نہ دے سکیں۔

امن کی طاقت اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے، اور صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ امن کی طاقت کو کامیاب طور پر استعمال کر سکے۔

تکمیلِ دین

ختم نبوت اور تکمیل دین دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیقی اسکیم کے مطابق، یہ لازمی طور پر ضروری ہے کہ اہل عالم کے سامنے ہر زمانہ میں خدا کی رہنمائی موجود رہے۔ پچھلے زمانوں میں یہ رہنمائی پیغمبروں کے ذریعہ فراہم کی جاتی تھی۔ انسانِ اول آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے رہنمائی کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور اس کے بعد ہر دور میں وہ مسلسل جاری رہا۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے —— ثم ارسلنا رسلنا تترا (المومنون ۴۴)

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن (الاحزاب ۴۰) میں اعلان کیا گیا کہ وہ آخری رسول ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی اور رسول آنے والا نہیں ہے۔ یہ اعلان سادہ طور پر صرف فہرست انبیاء کے پورے ہو جانے کا اعلان نہ تھا۔ اس کا لازمی مطلب یہ بھی تھا کہ ذات نبوت اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں رہے گی مگر بدل نبوت ہمیشہ دنیا میں بدستور باقی رہے گا۔

تکمیل دین (بمعنی استحکام دین) دراصل اسی فیصلہ خداوندی کا ظہور ہے۔ ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو نبوت کا بدل یا اس کا قائم مقام بنا دیا۔ قدیم زمانہ میں دین عدم استحکام کا شکار ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے نبی کے بعد وہ نبوت کا بدل نہیں بن سکتا تھا۔ پیغمبر آخر الزماں کے بعد، اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ دین کو پوری طرح مستحکم کر دیا گیا۔ اس طرح ختم نبوت کے بعد خود دین نبوت کا بدل بن گیا۔ قیامت تک یہ حالت باقی رہے گی، اس لیے اب قیامت تک محمد عربی کی نبوت بھی جاری رہے گی۔ اب کسی نئے نبی کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی معاملہ کو قرآن میں اکمال دین (یا تکمیل دین) کہا گیا ہے۔ یعنی دین کو اس طرح مستحکم کر دینا کہ قیامت تک اس کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے :

الیومَ یئسَ الذین کفروا من دینکم فلاتخشوھُم واخشونِ۔ الیومَ اکملت لکم دینکم واتممتُ علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ۳)

آج منکر لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، تم صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

اس آیت میں دین کامل سے مراد دین مستحکم ہے (لسان العرب ۱۱/۵۹۸، تفسیر النسفی ۱/۲۷۰) پچھلے زمانوں میں دین میں بار بار تحریف وتبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ مخالف طاقتیں پیغمبروں کے دین کو تاریخ تک سے مٹانے میں کامیاب ہوجاتی تھیں۔ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ عالم انسانی میں ایسا انقلاب لایا گیا کہ دینی عدم استحکام کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

ضحاک کے قول کے مطابق، قرآن کی یہ آیت فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں نازل ہوئی۔ یعنی ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے چودہ سو سال پہلے۔ اُس وقت کے حالات میں اِس آیت کی حیثیت مستقبل کے بارہ میں ایک جرأت مندانہ پیشین گوئی کی تھی۔ اس میں پیشگی طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ اب تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ اب خدا کے دین کے لیے تشتیتِ انسانی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اب خدا کا دین اتنا مستحکم ہوچکا ہے کہ مخالف طاقتیں آیندہ کبھی بھی اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں تمام کام اسباب عادی کے تحت انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کو شامل کرکے مذکورہ آیت کی تفسیر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آنے والے زمانوں میں تاریخ کا سفر صرف اس سمت میں ہوگا جو دینِ خداوندی کے موافق ہو۔ آیندہ پیش آنے والے واقعات صرف وہی رخ اختیار کریں گے جو دینِ خدا کا اثبات کرنے والے ہوں نہ کہ اس کی تردید کرنے والے۔

یہ پیشین گوئی تمام زمانوں میں مکمل طور پر پوری ہوئی ہے۔ اس طرح خالص علمی اور تاریخی سطح پر یہ ثابت ہوا ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ کیوں کہ خداوند عالم کے سوا کوئی بھی تاریخ کے بارہ میں ایسے فیصلہ کن اعلان پر قادر نہیں اور نہ کبھی کسی نے اس قسم کا فیصلہ کن اعلان تاریخ کے بارہ میں کیا۔

اس مختصر صحبت میں میں تاریخ کے تین بڑے واقعات کا ذکر کروں گا۔ یہ واقعات وہ ہیں جو بظاہر مخالف دین انقلاب کی حیثیت سے ظاہر ہوئے، مگر باعتبار نتیجہ وہ حامیٔ دین انقلاب بن گئے۔ یہ تین انقلابات ہیں —— آزادی، سائنس، اور سیکولرزم۔

۱- موجودہ زمانہ آزادی کا زمانہ ہے۔ جب کہ پچھلے تمام زمانے اظہار خیال پر پابندی کے زمانے رہے ہیں۔ ہر انسائکلوپیڈیا میں، خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، دنیا کے ہر حصے میں اور تاریخ کے ہر مرحلے میں، کسی نہ کسی شکل میں زبان وقلم پر احتساب قائم رہا ہے:

Some form of censorship has appeared in all communities, small and large, in all parts of the world, at all stages of history. (3/1083)

آزادیٔ اظہار پر اسی عمومی پابندی کا یہ نتیجہ تھا کہ مذاہب کی مقدس کتابیں کبھی کھلی تنقید کا موضوع نہ بن سکیں۔ تنقیدی جائزہ کی اس ممانعت کی بنا پر ایسا ہوا کہ ایک مذہبی کتاب اور دوسری مذہبی کتاب کا فرق بھی خالص علمی بنیاد پر واضح ہو کر سامنے نہیں آیا۔ مذہبی کتابوں کی حیثیت متعین کرنے کا معلوم ذریعہ صرف ایک تھا، اور وہ ان کتابوں کو ماننے والوں کا اپنا عقیدہ تھا۔ ہر گروہ اپنی مقدس کتاب کو یکساں درجہ میں آسمانی کتاب بنا رہا تھا، اس بنا پر لوگوں نے بھی ہر کتاب کو یکساں درجہ میں آسمانی کتاب فرض کر لیا تھا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ قرآن محفوظ آسمانی کتاب تھی اور دوسری تمام کتابیں غیر محفوظ آسمانی کتاب، قرآن پوری طرح غیر محرف تھا، جب کہ دوسری تمام مذہبی کتابیں تحریف کا شکار ہو چکی تھیں۔

موجودہ زمانہ میں جب کھلی آزادی کا دور آیا تو ہر چیز کی بے روک ٹوک جانچ ہونے لگی۔ حتی کہ مقدس مذہبی کتابیں بھی اس کی زد میں آگئیں۔ یہ عمل پچھلے تقریباً تین سو سال سے اہل علم کے درمیان جاری ہے۔ حتی کہ یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے جس کو ہائر کریٹیسزم، ہسٹاریکل کریٹیسزم، تنقید متن (textual criticism) وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اس آزادانہ جانچ کا یہ عظیم فائدہ ہوا کہ قرآن اور دوسری مقدس کتابوں کا فرق خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے ثابت ہو کر سامنے آگیا۔ ان ناقدین نے جس طرح دوسری مقدس کتابوں کی جانچ کی۔ اسی طرح انھوں نے قرآن کی بھی بے رحمانہ جانچ کی۔ مگر آخر کار جو بات ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے اور اس کے مقابلہ میں ہر ایک غیر محفوظ کتاب۔ قرآن غیر محرف ہے اور دوسری کتابیں محرف۔ قرآن ایک معتبر تاریخی کتاب ہے، جبکہ دوسری کتابوں کو تاریخی اعتباریت حاصل نہیں۔

مثال کے طور پر دور جدید کے علماء نے قرآن کے مختلف نسخے مختلف ملکوں سے حاصل کیے۔ انھوں نے مختلف زمانوں کے قرآنی نسخے ہاتھ سے لکھے ہوئے یا مطبوعہ قسم کے اکٹھا کیے۔ ان تمام جمع شدہ قرآنی نسخوں کا ایک دوسرے سے تقابل کیا گیا۔ مگر قرآن کے ہزاروں نسخوں میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی ادنیٰ فرق بھی دریافت نہ ہو سکا۔ بعض آیتوں کے بعض الفاظ میں قرأت (لہجہ) کا فرق ضرور تھا مگر جہاں تک مصحف میں کتابت کا سوال ہے، کتابت میں کوئی بھی جزئی یا کلی فرق ان میں پایا نہیں گیا۔

دوسری مقدس کتابوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے مختلف نسخوں میں ہزاروں واضح فرق پائے گئے۔ مثال کے طور پر تورات کے کچھ نسخوں میں ایک گروہ کی تعداد دس ہزار (Ten Thousands) بتائی گئی تھی۔ اور کچھ دوسرے نسخوں میں اسی گروہ کی تعداد کے لیے ہزاروں (Thousands) کا لفظ درج تھا۔ انجیل میں ایک مقام پر حضرت مسیح کے لیے ابن اللہ (son of God) لکھا ہوا ملا۔ اور اس کے کچھ دوسرے نسخوں میں حضرت مسیح کو ابن داؤد (son of David) لکھا ہوا تھا۔ وغیرہ۔

موجودہ دور آزادی قرآن اور اسلام کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا تھا۔ مگر آخری نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ اسلام کے حق میں صرف مفید ثابت ہوا۔ اس نے قرآن کے حق میں ایک نئی تاریخی دلیل فراہم کر دی۔ قرآن اور دوسری مقدس کتابوں کا فرق جو اب تک صرف مسلمانوں کے ذاتی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اب خود علم انسانی کی رو سے ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا۔ آزادی کا یہ طوفان بظاہر اہل اسلام کے لیے عُسر کا ایک واقعہ تھا۔ مگر آخری مرحلہ میں پہنچ کر وہ اہل اسلام کے لیے عین یُسر کے ہم معنی ثابت ہوا۔

۲۔ دوسرا فکری انقلاب جدید سائنسی انقلاب ہے۔ خاص طور پر انیسویں صدی عیسوی میں کسی چیز کو دریافت کرنے کا وہ طریقہ وضع ہوا جس کو سائنسی طریقہ (scientific method) کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں چیزوں کو قابل مشاہدہ یا قابل تجربہ واقعات کی روشنی میں جانچا جاتا ہے۔ اس طریقہ کے رواج سے انسان کو بہت سی نئی چیزوں کے بارہ میں واقفیت ہوئی۔ مثلاً شمسی نظام کا تفصیلی علم، یا زمین کی تہوں کے بارہ میں قطعی معلومات۔

ان مادی دریافتوں کے بعد ایک مستقل فلسفہ بنا جس کو عام طور پر پازیٹوزم (positivism) کہا جاتا ہے۔ اسی فلسفہ کے تحت یہ سمجھا جانے لگا کہ کسی حقیقی علم تک پہنچنے کا معیار (criterion) صرف ایک ہے، اور وہ براہ راست تجربہ یا مشاہدہ ہے جو قابل تصدیق (verifiable) ہو۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا گیا تو مذہبی معتقدات اس معیار علم پر پورے ہوتے نظر نہیں آئے۔ کیونکہ مذہبی عقائد تمام تر بالواسطہ استدلال یا استنباط کی بنیاد پر قائم تھے۔ مثلاً خدا کا وجود ناقابل مشاہدہ تھا۔ اس کے حق میں جو دلیل دی جاتی تھی وہ بس اس قسم کی تھی کہ اس عالم میں چونکہ ڈزائن ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک ڈزائنر ہو۔ اس قسم کا استنباطی استدلال جدید علمی معیار کے مطابق غیر معقول

تھا۔ اس لیے ان کو فرضی توجیہات (pseudo-explanations) کہہ کر رد کر دیا گیا۔ (invalid)

علم کی دنیا میں تقریباً سو سال تک یہ فکری ہنگامہ جاری رہا۔ مگر اس نقطۂ نظر میں فکری وزن صرف اس وقت تک تھا جب تک انسانی علم کی رسائی عالم کبیر (macro-world) تک محدود تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب انسانی علم کی رسائی عالم صغیر (micro-world) تک پہنچ گئی تو ساری صورت حال یکسر بدل گئی۔

اب معلوم ہوا کہ براہ راست استدلال کا میدان بہت محدود ہے۔ نئے حقائق جو انسان کے علم میں آرہے تھے وہ اتنے لطیف تھے کہ صرف استنباطی یا بالواسطہ استدلال ہی وہاں قابل عمل نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر جرمن سائنس داں رانٹجن (Wilhelm Conrad Rontgen) نے ۱۸۹۵ میں ایک تجربہ کے دوران پایا کہ اس کے سامنے کے شیشہ پر کچھ اثرات (effect) ظاہر ہو رہے ہیں جب کہ اس کے تجربہ اور اس شیشہ کے درمیان کوئی معلوم رشتہ موجود نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک ناقابل مشاہدہ شعاع (invisible radiation) ہے جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس کی نامعلوم نوعیت (unknown nature) کی بنا پر رانٹجن نے اس کا نام اکسرے (X-rays) رکھ دیا (19/1058)

بیسویں صدی میں اس طرح کے کثیر حقائق سامنے آئے جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہ تھا مگر ان کے بالواسطہ اثرات کی بنا پر ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے جدید علماء مجبور ہوئے کہ براہ راست استدلال کے ساتھ استنباطی استدلال کو بھی ایک معقول استدلالی معیار کے طور پر تسلیم کریں۔ کیوں کہ اس کے بغیر اکسریز کی تشریح نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر ایٹم کے سائنسی ڈھانچہ کو ماننا ممکن نہ تھا۔ اس کے بغیر بلیک ہول یا ڈارک میٹر کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وغیرہ۔

معیار استدلال میں اس توسیع کے بعد دینی معتقدات پر استدلال اتنا ہی معقول (valid) بن گیا جتنا کہ سائنسی نظریات پر استدلال۔ جس استنباطی منطق سے سائنس کے جدید نظریات ثابت کیے جارہے تھے عین اسی استنباطی منطق سے دینی عقیدہ بھی ثابت ہو رہا تھا۔

اس طرح چودہ سو سال پہلے قرآن کا یہ اعلان دوبارہ تاریخ میں قائم ہو گیا کہ انسانی افکار میں کوئی بھی تبدیلی اسلام کی حقانیت کو رد نہ کر سکے گی۔ آئندہ آنے والا کوئی بھی انقلاب

صرف دین خداوندی کی تصدیق کرے گا۔ وہ کسی بھی حال میں اس کی تردید کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

۳۔ تیسرا فکری انقلاب جس سے بعد کی تاریخ میں اسلام کا سابقہ پیش آیا وہ سیکولرزم ہے۔ یہ فکر یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ شروع ہوا۔ یہ سیکولرزم ایک ایسی تحریک تھی جو بعد کو آنے والی دنیا کے بجائے موجودہ مادی دنیا کو ساری اہمیت دیتی تھی :

.. a movement in society directed away from other worldlines to this worldlines. (X/19)

سیکولرزم کا نظریہ جدید دنیا پر ایک طاقتور سماجی اور سیاسی فکر کی حیثیت سے چھا گیا۔ نظری اعتبار سے اگرچہ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ملک کی اجتماعی پالیسی مذہبی امور میں عدم مداخلت (non-interference) کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ مگر عملاً وہ ایک زبردست مخالف مذہب (anti-religious) طاقت بن گیا۔ یہ معلوم ہونے لگا کہ سیکولرزم کی لہر اولاً مذہب کو زندگی کے حاشیہ کی طرف دھکیل دے گی، اور اس کے بعد ایک غیر حقیقی نظریہ کی حیثیت سے مذہب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

مگر قرآن کی پیشین گوئی دوبارہ فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دین خداوندی کا تعلق انسان کی ابدی فطرت سے ہے۔ مذہب کا احساس انسان کے لیے اسی طرح ناقابل تغیر ہے جس طرح پیاس کا احساس انسان کے لیے ناقابل تغیر ہے۔ سیکولرزم کی بنیاد پر بننے والے وسیع ترین ادارے اور انتہائی طاقت ور حکومتیں بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکیں کہ انسان خدائی دین کو چھوڑ کر سیکولرزم کو اپنا مذہب بنا لے۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز تجربہ وہ ہے جس کی مثال ترکی میں ملتی ہے۔ کمال اتاترک نے ترکی میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۴ میں اسلامی خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے جارحانہ سیکولرزم کو ملک کی پالیسی قرار دیا۔ انھوں نے ریاستی طاقت کے زور پر تمام دینی مدرسے اور تمام دینی ادارے یک لخت بند کر دیے۔ انھوں نے نئی قانون سازی کے ذریعہ ترکی کا پورا نظام لادینیت کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ حتی کہ ترکوں کے قدیم لباس کو بھی بزور تبدیل کر کے انھیں یورپی لباس پہننے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلہ میں ہر مخالفت کو طاقت کے ذریعہ کچل دیا گیا۔

اتاترک کے انتقال کے بعد ان کے ساتھی عصمت انونو (م ۱۹۷۳) ترکی کے صدر مقرر ہوئے۔

ھوں نے بھی پوری وفاداری کے ساتھ اتاترک کی جارحانہ سیکولر پالیسی جاری رکھی ۔ مگر تقریباً
چاس سال کی مخالفِ اسلام حکومتی مہم کے باوجود ترکی میں اسلام زندہ رہا ۔ اتاترک کی اسلام کو ختم کرنے
ں پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوگئی ۔ حتی کہ خود عصمت انونو کو اپنی آخر عمر میں اس کا اعتراف کرنا پڑا ۔
عصمت انونو جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخر وقت میں انھوں نے اس معاملہ میں اپنا جو تاثر
یان کیا وہ عربی رپورٹ کے مطابق یہ تھا :

نی لا اکاد اصدق ما اری ۔ لقد بذلنا کل
ا نستطیع لانتزاع الاسلام من نفوس
لاتراك وغرس مبادئ الحضارة الغربية
مكانه ۔ فاذا بنا نفاجأ بما لم نكن نتوقعه ۔
لقد غرسنا العلمانية فاثمرت الاسلام
(الوعی الاسلامی ، ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ)

میرے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے جس کو میں دیکھ
رہا ہوں ۔ ہم نے اپنے بس بھر تمام کوشش کی کہ ترکوں
کے دل سے اسلام کو نکال دیں ۔ اور اس کی جگہ مغربی
تہذیب کو ان کے اندر داخل کر دیں ۔ مگر حیرت انگیز
طور پر نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا ۔ چنانچہ ہم نے
تو سیکولرزم کا پودا بویا مگر پھل نکلا تو وہ اسلام تھا ۔

اس سلسلہ میں دوسری ناکام مثال سوویت یونین کی ہے ۔ اس علاقہ میں اولاً فکری طور پر اور
پھر ۱۹۱۷ سے طاقت ور حکومت کے زور پر اسلام کو مٹانے کی کوشش کی گئی ۔ مجموعی طور پر یہ کوشش
تقریباً ایک سو سال تک جاری رہی ۔ مگر ۱۹۹۱ میں خود کمیونسٹ ایمپائر ٹوٹ گیا ۔ اور اس کے بعد
حیرت انگیز طور پر اس کے ملبہ سے اسلام زندہ حالت میں نکل آیا ۔

امریکی میگزین ٹائم (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے سوویت علاقہ کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع کی
تھی ۔ اس رپورٹ کا خاص مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ نئے روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے ۔ اس سلسلہ
میں اس نے ۵۵ ملین سوویت مسلمانوں کا بھی جائزہ لیا تھا ۔ اس نے بتایا تھا کہ اس علاقہ میں اسلام
دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہوگیا ہے ۔ اس باتصویر رپورٹ کی سرخی بامعنی طور پر یہ تھی —
کارل مارکس محمد کو جگہ دیتا ہے :

Karl Marx makes room for Muhammad.

اسلام کے خلاف تاریخ کا ہر چیلنج صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ اسلام ابدی طور پر ایک دین
مستحکم ہے ، اس کو کوئی زیر کرنے والا نہیں ۔

آخری بات

یہاں ہم نے صرف دورِ جدید کے چند انقلابات کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس قسم کے ناموافق واقعات پچھلے چودہ سو سال میں بار بار پیش آئے ہیں۔ ہر واقعہ اپنی ابتدا میں مخالفت اسلام کا واقعہ نظر آتا تھا۔ مگر اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ عین حمایت اسلام کا واقعہ بن گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا غلبہ اور پھر اسلام کی فکری قوت سے ان کا مغلوب ہونا اسی نوعیت کی ایک مشہور مثال ہے۔

تاریخ کا یہ متواتر تجربہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ بخش خوش خبری ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اسلام کے حق میں فکری غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ کسی بھی طوفان کو دیکھ کر مایوس نہ ہوں۔ بلکہ یقین کے سرمایہ کے ساتھ اسلام کی دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مخالف کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر تم اس کے سامنے دعوتِ خیر پیش کرو تو تم دیکھو گے کہ جو بظاہر تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے :

والآن ونحن نواجه الصعوبات والمشكلات۔ لو اننا اقمنا القرآن فسوف يثبت التاريخ وكانما سيف التتر قد ظهر مرة اخرى كي يتحول الى خادم وحام لدين الله كما حدث في القرن السابع الهجري۔

فرشتہ کی مدد

عن ابی ھریرۃ قال : ان رجلا شتم ابابکر، والنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم جالس یتعجب ویتبسم ، فلما اکثر رد علیہ بعض قولہ ، فغضب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم، وقام، فلحقہ ابوبکر، وقال : یارسول اللّٰہ کان یشتمنی وانت جالس ، فلما رددت علیہ بعض قولہ غضبت وقمت قال : کان معک ملک یرد علیہ ، فلما رددت علیہ وقع الشیطان

(رواہ احمد)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر کو برا کہا (حضرت ابوبکر چپ رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے ، آپ تعجب کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ پھر جب اس شخص نے بہت زیادہ کہا تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر چل کر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسول وہ آدمی مجھ کو برا کہہ رہا تھا اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے (اور خوش تھے) لیکن جب میں نے اس کی بعض بات کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ (جب تم چپ تھے) تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا۔ مگر جب تم نے خود اس کی بات کا جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آگیا۔

ایک آدمی آپ کو برا کہے۔ اس کے جواب میں آپ بھی اس کو برا کہیں تو بات بڑھتی ہے۔ جس آدمی نے پہلے صرف ایک سخت لفظ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ سب وشتم پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ آپ کا جواب نہ دینا اس کو ابتدائی حد پر روک دیتا ہے ، اور آپ کا جواب دینا اس کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کو برا کہے یا گالی دے مگر آپ خاموش ہو جائیں۔ آپ اشتعال انگیز کلام کے باوجود مشتعل نہ ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ دھیما ہو رہا ہے۔ اس کے غبارے کی ہوا نکلنا شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ چپ ہو جائے گا۔ آپ کا بولنا دوسرے کو مزید بولنے پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر آپ چپ ہو جائیں تو آپ کا

آخری بات

یہاں ہم نے صرف دورِ جدید کے چند انقلابات کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس قسم کے ناموافق واقعات پچھلے چودہ سو سال میں بار بار پیش آئے ہیں۔ ہر واقعہ اپنی ابتدا میں مخالفت اسلام کا واقعہ نظر آتا تھا۔ مگر اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ عین حمایت اسلام کا واقعہ بن گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا غلبہ اور پھر اسلام کی فکری قوت سے ان کا مغلوب ہونا اسی نوعیت کی ایک مشہور مثال ہے۔

تاریخ کا یہ متواتر تجربہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ بخش خوش خبری ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اسلام کے حق میں فکری غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ کسی بھی طوفان کو دیکھ کر مایوس نہ ہوں۔ بلکہ یقین کے سرمایہ کے ساتھ اسلام کی دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مخالف کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر تم اس کے سامنے دعوتِ خیر پیش کرو تو تم دیکھو گے کہ جو بظاہر تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن گیا ہے :

والآن ونحن نواجه الصعوبات والمشكلات - لو اننا اقمنا القرآن فسوف يثبت التاريخ وكانما سيف التتر قد ظهر مرة اخرى كي يتحول الى خادم وحام لدين الله كما حدث فى القرن السابع الهجرى۔

فرشتہ کی مدد

عن ابی ھریرة قال : ان رجلا شتم ابا بکر، والنبی صلی اللہ علیہ وسلم جالس یتعجب ویتبسم ، فلما اکثر رد علیہ بعض قولہ ، فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وقام، فلحقہ ابوبکر، وقال : یارسول اللہ کان یشتمنی وانت جالس ، فلما رددت علیہ بعض قولہ غضبت وقمت قال : کان معک ملک یرد علیہ ، فلما رددت علیہ وقع الشیطان

(رواہ احمد)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر کو برا کہا (حضرت ابوبکر چپ رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے، آپ تعجب کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ پھر جب اس شخص نے بہت زیادہ کہا تو حضرت ابوبکر نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر چل کر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسول وہ آدمی مجھ کو برا کہہ رہا تھا اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے (اور خوش تھے) لیکن جب میں نے اس کی بعض بات کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ (جب تم چپ تھے) تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا۔ مگر جب تم نے خود اس کی بات کا جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آگیا۔

ایک آدمی آپ کو برا کہے۔ اس کے جواب میں آپ بھی اس کو برا کہیں تو بات بڑھتی ہے۔ جس آدمی نے پہلے صرف ایک سخت لفظ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ سب و شتم پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ آپ کا جواب نہ دینا اس کو ابتدائی حد پر روک دیتا ہے، اور آپ کا جواب دینا اس کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کو برا کہے یا گالی دے مگر آپ خاموش ہو جائیں۔ آپ اشتعال انگیز کلام کے باوجود مشتعل نہ ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ دھیما ہو رہا ہے۔ اس کے غبارے کی ہوا نکلنا شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ چپ ہو جائے گا۔ آپ کا بولنا دوسرے کو مزید بولنے پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر آپ چپ ہو جائیں تو آپ کا

چپ ہونا آخر کار دوسرے شخص کو بھی چپ ہونے پر مجبور کر دے گا۔

دونوں صورتوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب برا کرنے والے کا جواب برائی سے دیا جائے تو اس کے اندر ردعمل کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس کی انا کو جگائے۔ وہ اس کے غصہ کو بڑھا کر اس کو آخری درجہ تک پہنچا دے۔ وہ برائی جو اس کے اندر سوئی ہوئی تھی، وہ پوری طرح جاگ کر آپ کے بالمقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب برا کرنے والے کے ساتھ اعراض کا معاملہ کیا جائے تو اس کے اندر خود احتسابی کی نفسیات جاگتی ہے۔ اب فرشتہ کو موقع ملتا ہے کہ وہ آدمی کی فطرت کو بیدار کرے۔ وہ اس کے ضمیر کو متحرک کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ اس کو اپنی اصلاح پر ابھارے۔

پہلی صورت میں آدمی شیطان کے زیر اثر چلا جاتا ہے اور دوسری صورت میں فرشتہ کے زیر اثر۔ ایک واقعہ کی صورت میں دوسرے کو ملزم ٹھہرا کر اس سے انتقام لینے کے جذبات بھڑکتے ہیں اور دوسرے واقعہ کی صورت میں اپنے کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی اصلاح کرنے کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

ہر آدمی کے سینہ میں دو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک طاقت آپ کی موافق ہے جس کی نمائندہ آدمی کا ضمیر ہے۔ دوسری طاقت آپ کی مخالف ہے۔ اس کی نمائندہ آدمی کی انا ہے۔ اب یہ آپ کے اپنے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس طاقت کو جگاتے ہیں۔ آپ اپنے قول وعمل سے جس طاقت کو جگائیں گے وہی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک طاقت کو جگانے کی صورت میں فریق ثانی آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اور اگر آپ نے دوسری طاقت کو جگایا تو خود فریق ثانی کے اندر ایک ایسا عنصر نکل آئے گا جو آپ کی طرف سے عمل کر کے اس کو آپ کے مقابلہ میں مغلوب ومفتوح بنا دے۔

مذکورہ واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی پر غصہ نہیں ہوئے جو بدکلامی کر رہا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کی زبان سے برا کلمہ نکلا تو آپ غصہ ہو گئے۔ گدھے کے لیے شریعت میں اعراض کا اصول ہے اور انسان کے لیے امر بالمعروف کا اصول۔

عام طور پر لوگ جواب دینے کو دفاع سمجھتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کوئی تکلیف پہنچے تو فوراً اس سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ دفاع کر رہے ہیں، مگر اس سے بھی زیادہ بڑا دفاع یہ ہے کہ زیادتی کے جواب میں آدمی خاموش ہو جائے۔ مقابلہ کے بجائے وہ اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔

خاموشی بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑا عمل ہے۔ آدمی جب جوابی ٹکراؤ کرتا ہے تو وہ صرف اپنی ذات پر بھروسہ کر رہا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ زیادتی کے بعد چپ ہو جاتا ہے تو وہ پورے نظام فطرت کو اپنی طرف سے مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔ ذاتی دفاع ایک کمزور دفاع ہے۔ اور فطرت کا دفاع زیادہ طاقت ور دفاع۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں یہ نظام قائم کیا ہے کہ جب بھی کہیں کوئی گندگی پیدا ہوتی ہے تو فوراً بے شمار بیکٹیریا وہاں جمع ہو کر اس مادہ کو (decompose) کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ گندگی کا خاتمہ کر سکیں۔ اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قائم ہوا نظام ہے کہ جب کوئی انسان کسی کے اوپر زیادتی کرے تو پورا نظام فطرت اس کی اصلاح کے لیے حرکت میں آجائے۔

اس اعتبار سے خاموشی گویا ایک قسم کا انتظار ہے۔ جب آدمی زیادتی پر خاموش ہو جاتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو حالتِ انتظار کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ عالمی ضمیر کو کام کرنے کا موقع دے کر اس کے نتیجہ کا منتظر ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ خود اقدام کر کے فطرت کے عمل میں بگاڑ نہ پیدا کرے۔ بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کر کے فطرت میں ہونے والے عمل کے ساتھ تعاون کرے۔

ایک شہادت

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم پر جو مقالہ ہے، اس کے آ
میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بہت کم بڑے لوگ اتنا زیادہ بدنام کیے گیے ہیں جتنا کہ محمد کو بدنام کیا گیا
قرون وسطی کے یورپ کے مسیحی علمار نے ان کو فریبی اور عیاش اور خونی انسان کے روپ میں پیش
حتی کہ آپ کے نام کا ایک بگڑا ہوا لفظ مہاونڈ (نعوذ باللہ) شیطان کے ہم معنی بن گیا۔ محمد اور ان کے
مذہب کی یہ تصویر اب بھی کسی قدر اپنا اثر رکھتی ہے۔ انگریز مصنف ٹامس کارلائل پہلا قابل ذ
مغربی شخص تھا جس نے ۱۸۴۰ میں بتاکید عوامی طور پر کہا کہ محمدؐ یقیناً سنجیدہ تھے کیوں کہ یہ فرض
بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک فریبی آدمی ایک عظیم مذہب کا بانی ہو سکتا ہے:

Few great men have been so maligned as Muhammad. Christian scholars of medieval Europe painted him as an impostor, a lecher, and a man of blood. A corruption of his name, 'Mahound, even came to signify the devil. This picture of Muhammad and his religion still retains some influence. The English author Thomas Carlyle in 1840 was the first notable European to insist publicly that Muhammad must have been sincere, because it was ridiculous to suppose an impostor would have been the founder of a great religion (12/609).

مغربی پروپیگنڈے کی تردید کے لیے ٹامس کارلائل نے یہاں جو دلیل استعمال کی ہے، و
کسی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ درست اور یقینی ہے۔ درخت
اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے کردار سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص پیغ
اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھے، جو یہ دیکھے کہ روز و شب آپ کن سرگرمیوں میں مصروف ا
تھے اور یہ کہ آپ کے اثر سے کس قسم کی تحریک برپا ہوئی، وہ ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ یہ سب نو
ایک فریبی انسان کا کارنامہ ہے۔

ایک شخص جس کے کلام میں تعمیر انسانیت کی باتیں ہوں، جس کا لہجہ درد اور سوز سے بھ
ہو، جس کے مشن سے لوگوں کی زندگیوں میں صالح انقلاب آرہا ہو، وہ کبھی فریبی انسان نہیں ہو
فریبی انسان ایک فریبی تحریک اٹھا سکتا ہے نہ کہ ایک صالح ربانی تحریک۔

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

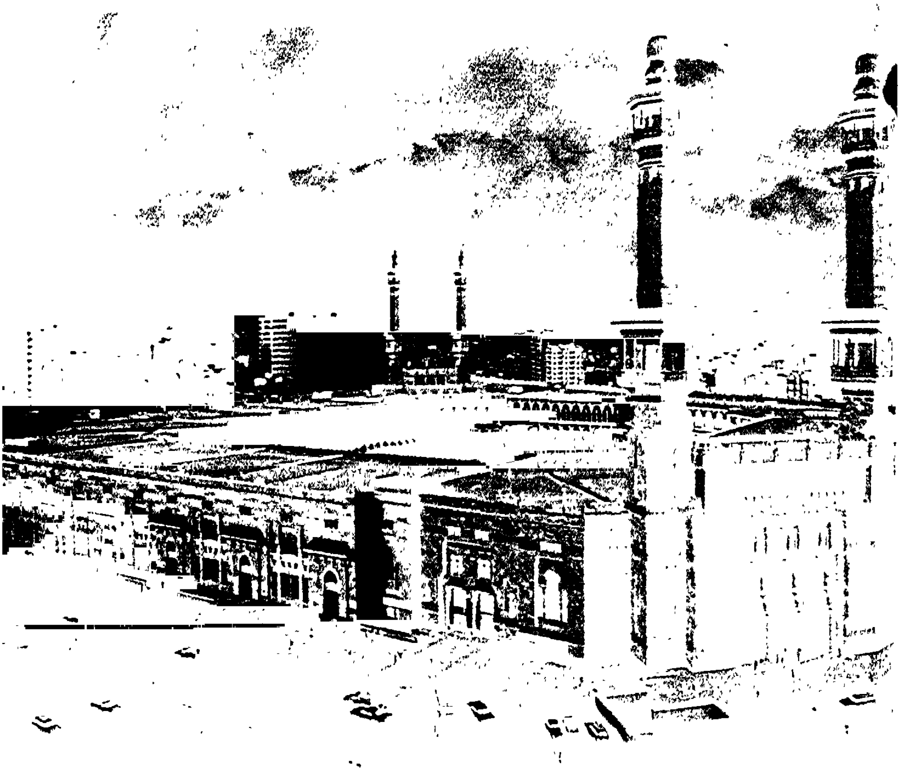


الرسالہ

Al-Risala

September 1994 Issue 214 Rs. 6

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



پیچھے دیکھنے والا پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے
اور آگے دیکھنے والا ہمیشہ آگے کی طرف۔

ırises	85/-
nmad	85/-
rophet of Revolution	
As It Is	40/-
Driented Life	60/-
on and Science	40/-
Muslims	65/-
lay to Find God	12/-
eachings of	15/-
ood Life	12/-
arden of	15/-
se	
re of Hell	15/-
now Thyself!	4/-
nmad	5/-
eal Character	
1 Movement	20/-
ımy and Islam	3/-
of the Prophet	--
the Voice	--
nan Nature	
the Creator	--
dern Age	

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول 200/-
تذکیر القرآن جلد دوم 200/-
اللہ اکبر 45/-
پیغمبر انقلاب 40/-
مذہب اور جدید چیلنج 45/-
عظمت قرآن 30/-
عظمت اسلام 50/-
عظمت صحابہ 7/
دین کامل 50/-
الاسلام 40/-
ظہور اسلام 40/-
اسلامی زندگی 25/-
احیاء اسلام 20/-
رازِ حیات 50/-
صراط مستقیم 40/
خاتونِ اسلام 50/-
سوشلزم اور اسلام 40/
اسلام اور عصر حاضر 30/-
الربانیہ 40/-
کاروان ملت 45/-
حقیقت حج 30/-
اسلامی تعلیمات 25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق 25/-
حدیث رسول 25/
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار) 85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار) -
میوات کا سفر 35/-
قیادت نامہ 20/-
راہِ عمل 25/-
تعبیر کی غلطی 60/-
دین کی سیاسی تعبیر 20/-

مطالعۂ سیرت 9/-
ڈائری جلد اول -
کتاب زندگی 40/-
انوار حکمت -
اقوال حکمت 20/-
تعمیر کی طرف 8/-
تبلیغی تحریک 20/-
تجدید دین 20/-
عقلیات اسلام 30/-
مذہب اور سائنس -
قرآن کا مطلوب انسان 8/
دین کیا ہے 8/
اسلام دین فطرت 7/
تعمیر ملت 6/-
تاریخ کا سبق 7/
فسادات کا مسئلہ 5/
انسان اپنے آپ کو پہچان 5/-
تعارف اسلام 5/-
اسلام پندرھویں صدی میں 5/-
راہیں بند نہیں 7/-
ایمانی طاقت 7/-
اتحاد ملت 7/
سبق آموز واقعات 7/
زلزلۂ قیامت 10/-
حقیقت کی تلاش 7/-
پیغمبر اسلام 5/-
آخری سفر 7/-
اسلامی دعوت 7/-
خدا اور انسان 7/-
حل یہاں ہے 10/-
سچا راستہ 5/-
دینی تعلیم 7/-

حیات طیبہ 7/-
باغ جنت 7/-
نار جہنم 7/-
خلیج ڈائری 10/
رہنمائے حیات 7/-
مضامین اسلام 30/
تعدد ازواج 3/-
ہندستانی مسلمان 40/-
روشن مستقبل 7/-
صوم رمضان 7/-
علم کلام 9/-
اسلام کا تعارف 4/-
علماء اور دور جدید 8/-
سیرت رسول
ہندستان آزادی کے بعد 3/
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے 8/
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ 7/
الاسلام یتحدی 85/

ہندی

سچائی کی تلاش 8/
انسان اپنے آپ کو پہچان 4/-
پیغمبر اسلام 4/-
سچائی کی کھوج -
آخری سفر 8/-
اسلام کا پریچے 8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی 8/-
راستے بند نہیں 7/-
جنت کا باغ 8/-
بہو پتنی واد اور اسلام 3/-
اتہاس کا سبق 9/
اسلام ایک سوابھاوک مذہب

آڈیو کیسٹ

حقیقت ایمان
حقیقت نماز
حقیقت روزہ
حقیقت زکوٰۃ
حقیقت حج
سنت رسول
میدان عمل
پیغمبرانہ رہنمائی
اسلامی دعوت کے جدید امکانات
اسلامی اخلاق
اتحاد ملت
تعمیر ملت
نصیحت لقمان

ویڈیو کیسٹ

حقیقت روزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۴

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel 4611128, 4697333
Fax 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

خدا کا عقیدہ

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ "بے سبب" خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو "بے سبب" میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب کار فرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہیے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں، اس لیے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق اس کو لازم قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ جب ہم بے سبب خدا کو مانتے ہیں تو ہم دو ممکن ترجیحات میں سے آسان تر کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

یہ صرف خدا کے وجود کا معاملہ نہیں۔ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے، اس دنیا میں کوئی بھی چیز نہ ثابت (prove) کی جا سکتی اور نہ غیر ثابت (disprove) کی جا سکتی۔ کسی بھی چیز کو ماننے کے

معاملہ میں یہاں انتخاب (option) ثابت شدہ (proved) اور غیر ثابت شدہ (unproved) کے درمیان نہیں۔ بلکہ ہر انتخاب ورک ایبل (workable) اور نان ورک ایبل (non-workable) کے درمیان ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اہل سائنس عام طور پر کشش (gravity) کے نظریہ کو مانتے ہیں۔ مگر یہ ماننا اس لیے نہیں کہ کشش ثقل کوئی ثابت شدہ نظریہ ہے۔ نیوٹن نے سیب کو درخت سے گرتے ہوئے دیکھ کر یہ سوال کیا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا اور پھر تحقیق کرکے اس نے کشش ارض کا نظریہ دریافت کیا۔ مگر ایک سائنس داں نے کہا کہ نیوٹن کو اس پر تعجب ہوا تھا کہ سیب نیچے کیوں آیا۔ مجھے یہ تعجب ہے کہ سیب اوپر کیسے گیا۔

درخت کی جڑ نیچے کی طرف جاتی ہے اور اس کا تنہ اوپر کی طرف۔ اگر جڑ کے نیچے جانے کا سبب یہ بتایا جائے کہ زمین میں کشش ہے تو تنہ اور شاخوں کے اوپر جانے کی توجیہہ کس طرح کی جائے گی۔

یہی معاملہ تمام سائنسی نظریات کا ہے۔ سائنس میں جب بھی کسی نظریہ کو مانا جاتا ہے تو وہ غیر ثابت شدہ کے مقابلہ میں ثابت شدہ کو ماننا نہیں ہوتا۔ بلکہ نان ورک ایبل تھیوری کے مقابلہ میں ورک ایبل تھیوری کو ماننا ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول نظریۂ خدا کے معاملہ میں بھی چسپاں ہوتا ہے۔

کشش کے معاملہ میں ہمارے لیے جو انتخاب ہے وہ باکشش مادہ اور بے کشش مادہ میں نہیں ہے۔ بلکہ باکشش مادہ اور غیر موجود مادہ میں ہے۔ چونکہ غیر موجود مادہ کا نظریہ ورک ایبل نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے باکشش مادہ کا انتخاب لے رکھا ہے، خالص علمی اعتبار سے یہی معاملہ خدا کے عقیدہ کا بھی ہے۔

کائنات کے اندر تخلیق کی صلاحیت نہیں، وہ اپنے اندر کے ایک ذرہ کو نہ گھٹا سکتی اور نہ بڑھا سکتی۔ اس لیے، دوسرے تمام سائنسی نظریات کی طرح، یہاں بھی ہمارے لیے انتخاب باخدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات (non-existent universe) میں ہے۔ چوں کہ ہم غیر موجود کائنات کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ باخدا کائنات کے نظریہ کا انتخاب کریں۔

علماء کا مسلک

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱) ابن کثیر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیدائش کی اصل ایک باپ اور ایک ماں سے ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی طرف مائل ہوں (ان اصل الخلق من اب واحد وام واحدة لیعطف بعضهم علی بعض (تفسیر ابن کثیر ۱/۴۴۸)

النسائی، احمد اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انسان یکساں طور پر اللہ کے بندے ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (ان العباد کلهم اخوة) اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے (الا کلکم بنو آدم و آدم من تراب)

اس اسلامی اصول کے مطابق، مسلمان اور غیر مسلم سب ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی صحیح ترین صورت یہ ہے کہ اس کو برادرانہ بنیاد پر استوار کیا جائے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کو "متحدہ قومیت" سے تعبیر کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولانا موصوف کی کتاب، متحدہ قومیت اور اسلام، مطبوعہ ۱۹۳۸، مجلس قاسم العلوم دیوبند) مولانا حسین احمد مدنی کے ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو: مکتوبات شیخ الاسلام، جلد اول، مکتوب ۶۳۔ صفحہ ۱۲۱ - ۱۴۷

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کے تقریباً تمام علماء اس مسلک پر متفق تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی کی طرح متحد کرنا چاہتے تھے۔ مگر بعض ناموافق اسباب کی بنا پر، قومی اتحاد کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس، دونوں فرقوں کا تعلق، تقسیم اور علاحدگی پسندی کی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ اس تفریقی سیاست کے نہایت مہلک نتائج برآمد ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا طوفان ختم ہوا تو مولانا ابو الکلام آزاد نے دسمبر ۱۹۴۷ میں لکھنؤ میں ایک مسلم کانفرنس کی۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے

ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ فرقہ واریت کو جو مذہب کے نام پر ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ اگر ہمیں بربادی سے بچنا ہے تو فرقہ پرستی کے تمام دروازوں کو ہمیں بند کرنا پڑے گا۔ اور ہندو مسلم تعلق کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ علماء کے اس مسلک کو جو مکمل طور پر قرآن وسنت پر مبنی تھا، اس کو دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے بلاشبہ صحیح اور مفید پالیسی یہی ہے کہ اس ملک میں دونوں فرقوں کے تعلق کو اخوت اور اتحاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

الرسالہ مشن پچھلے ۲۰ سال سے یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس مشن کو اسلام اور علماء اسلام کی مکمل تائید حاصل ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس اصلاحی مہم کو مزید موثر اور کامیاب بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی نکات حسب ذیل ہیں :

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ ان کے باہمی تعلق کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے کہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا میں برادرانہ اختلاط ہونے لگے۔

۲۔ مسلمان احتجاج غیر کے بجائے تعمیر ذات کو اپنی مستقل پالیسی بنائیں۔ وہ احتجاج اور مظاہرہ اور جلوس کے طریقہ کو یکسر چھوڑ دیں۔ شکایت کے مواقع پر وہ ٹکراؤ سے بچیں اور ہمیشہ پُرامن تدبیر کے ذریعہ نزاعی معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ نزاع کے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ نزاع کو بڑھاتا ہے اور مفاہمت کا طریقہ نزاع کو ختم کر دیتا ہے۔

۳۔ تعلیم اور اقتصادیات کو سب سے زیادہ قابل توجہ چیز قرار دیا جائے۔ مسلمانوں میں تعلیم اگر عام ہو اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۴۔ ہر مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک امن کمیٹیاں بنائی جائیں۔ اس کے ذریعہ یہ کوشش ہو کہ امن اور اتحاد کو برہم کرنے والے ہر واقعہ کو ابتدا ہی میں حسن تدبیر سے ختم کر دیا جائے۔

۵۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھیں۔ رایوں کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کریں۔

امید کا نظام

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ (الشوریٰ ۳۰)

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

کوئی آدمی جن مسائل سے دوچار ہوا اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر نربھر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یعنی ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے ازسرِ نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

ترقی کے آداب

اس دنیا میں ہر آدمی ترقی کرنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم آدمی ہیں جو فی الواقع کوئی بڑی ترقی حاصل کرتے ہوں۔ زیادہ لوگ معمولی یا اوسط درجہ کی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ کیا کچھ لوگ خوش قسمت پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ لوگ پیدائشی طور پر محروم اور بدقسمت ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ایسا کہنا خدا پر بے انصافی کا الزام عائد کرنا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہیں کرتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی بڑی بڑی ترقیوں کا امکان اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ جو آدمی عقلمندی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرتا ہے۔ اور جو آدمی اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا۔ یا اسی کے ساتھ مہلک نادانیاں بھی کرتا رہتا ہے وہ کامیابی اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔

مثلاً کچھ لوگ چھلانگ لگانے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات غیر دانش مندانہ طور پر چھلانگ لگا کر اپنا ہاتھ پاؤں توڑ لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں ترقی ہمیشہ لمبی محنت اور مستقل کوشش سے ملتی ہے۔ وقتی چھلانگ لگانے سے کسی کو ترقی نہیں مل سکتی۔

کچھ لوگ دوسروں سے چھین جھپٹ میں ترقی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ دوسرے کی چیز کبھی آپ کی چیز نہیں بن سکتی۔ اگر بالفرض آپ کسی غلط تدبیر سے دوسرے کی چیز کو ہڑپ کر لیں۔ دوسرے کی چیز پر ناجائز قبضہ کر کے بیٹھ جائیں تو اس طرح آپ کبھی ترقی کا مقام نہیں پا سکتے۔ یہ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ قدرت کا قانون جلد یا بدیر آپ کو رسوا کر کے رکھ دے گا۔ وہ آپ کی آئندہ نسلوں تک کو ترقی اور کامیابی سے محروم کر کے چھوڑ دے گا۔

کچھ لوگوں کی ترقی اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ حرص اور خود غرضی میں حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ لیں، دوسروں کو کچھ نہ ملنے دیں۔ حالاں کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اُس کو اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں دینے والا پائے۔ دوسروں کو نفع پہنچانے والا خود بھی نفع اٹھائے۔ اپنی کمائی میں دوسروں کا حصہ لگانے والا دوسروں کی کمائی میں

۱۹ ستمبر ۱۹۹۴

ختم کر دیا ہے۔

کچھ لوگ حسد اور جلن میں پڑ کر اپنی ترقی کا راستہ روک لیتے ہیں۔ جب وہ کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کی کاٹ میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اس کی کامیابیوں پر جلنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھیں تو آپ بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں دوسروں کی ترقی سے آپ کے اندر شوق پیدا ہونا چاہئے نہ کہ حسد۔

بڑی ترقی حاصل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ دوسروں کو ساتھ لے کر چل سکیں کوئی بھی آدمی اکیلے اکیلے بڑی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ اگر بڑی ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دوسروں کا دل جیتنا ہوگا۔ دوسروں کے اندر اپنا اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح رہنا ہوگا کہ دوسرے لوگ آپ کو اپنا سچا خیر خواہ سمجھیں۔ آپ کو ایسا بننا ہوگا کہ جو کچھ آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی آپ دوسروں کے لئے بھی پسند کریں۔ اور جو کچھ آپ کو اپنے لئے پسند نہیں ہے وہ آپ کو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ ہو۔

اس دنیا میں ترقی ہر آدمی کا حق ہے۔ ترقی ہر آدمی کا مقدر ہے۔ ترقی ہر آدمی کے لئے لکھ دی گئی ہے۔ مگر ترقی صرف اس کے لئے ہے جو ترقی کے اصول اور آداب کو جانے اور ان کو درست طور پر اپنی زندگی میں استعمال کرے۔

زلزلہ قدرت کا ایک مظہر ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آتے رہتے ہیں۔ پہلے جب زلزلہ آتا تھا تو بہت زیادہ جانی نقصان ہوتا تھا۔ مگر اب ترقی یافتہ ملکوں، مثلاً جاپان، کیلی فورنیا (امریکہ) وغیرہ میں زلزلہ آتا ہے تو بہت کم آدمی مرتے ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ اور تجربہ سے لوگوں نے جانا کہ زلزلہ میں جان کا نقصان زیادہ تر مکانوں کے گرنے سے ہوتا ہے۔ اس کا حل زیادہ پختہ یا زیادہ مضبوط مکان بنانا نہیں ہے۔ کیوں کہ زلزلہ کے مقابلہ میں کوئی بھی مکان مضبوط نہیں۔ اسی طرح اس کا یہ حل بھی نہیں تھا کہ زلزلہ کے خلاف شکایت اور احتجاج کیا جائے۔ کیوں کہ زلزلہ نیچر کے قانون کے تحت آتا ہے، اور نیچر کے خلاف احتجاجی شور وغل کبھی موثر نہیں ہو سکتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس مسئلہ کا حل یہ نکالا گیا کہ وہ لوگ اپنے مکان زیادہ پختہ

بنانے کے بجائے لوز انداز میں بنانے لگے۔ وہاں زلزلہ اب بھی آتا ہے۔ مگر اب یہ ہوتا ہے کہ زلزلہ کے جھٹکے کے وقت مکانات صرف ہل کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر گرتے نہیں۔ اس طرح انسانوں کے مرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیوں کہ انسان چھتوں اور ملبوں کے نیچے دب کر مرجاتے تھے نہ کہ محض جھٹکے سے۔

یہی معاملہ خود انسانوں کا بھی ہے۔ ہر آدمی اپنے سینہ کے اندر ایک خطرناک زلزلہ چھپائے ہوئے ہے۔ یہ غصہ اور انتقام کا زلزلہ ہے۔ ایک آدمی کو جب دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچتی ہے، ایک شخص کو جب دوسرے شخص سے کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے سینہ میں انتقام کا زلزلہ آجاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے گھر اور دکان میں آگ لگا دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے۔

یہ گویا سماجی زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ بھی فطرت کا ایک مظہر ہے۔ ہم اس کے وجود کو مٹانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہاں بھی ہم یہی کر سکتے ہیں کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچالیں۔ اپنی عقل کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اس کی زد میں نہ آنے دیں۔

اس سماجی زلزلہ کے مقابلہ میں حکیمانہ تدبیر کیا ہے۔ ایک لفظ میں، وہ اعراض ہے۔ یعنی ٹکراؤ کے مواقع کو اوائڈ کرنا۔ آپ کو کوئی برا کہے تو اس کا اثر نہ لیجئے۔ کسی کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کلمہ آپ کے کان میں پڑے تو اس کو سنی ان سنی کر دیجئے۔ کوئی آپ کے کپڑے کے اوپر کیچڑ ڈال دے تو کیچڑ ڈالنے والے سے الجھنے کے بجائے پانی کے نل کے پاس جائیے اور اس کو دھو دیجئے۔ راستہ چلتے ہوئے کوئی شخص آپ کے اوپر کنکری پھینک دے تو اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیے۔ غرض ناخوشگوار باتوں کو بھلا کر اعتدال کے ساتھ اپنا سفر حیات جاری رکھئے۔

زمینی زلزلے کبھی بند نہیں ہوں گے۔ زمینی زلزلوں کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ان کے نقصان سے اپنے آپ کو بچالیں۔ اسی طرح انسانی یا سماجی زلزلے بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یہاں بھی جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ ہم اعراض اور برداشت کی تدبیر کو استعمال کر کے اپنے آپ کو ان کی زد میں نہ آنے دیں۔ اپنے آپ کو ان کے نقصانات سے محفوظ رکھیں۔

یہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو آزادی ہے۔ ایک آدمی جب اپنی آزادی کو بے جا استعمال کرتا ہے تو وہ دوسرے آدمی کے لئے مسئلہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں کو بے قید طور پر استعمال میں لاتا ہے تو وہ ایسا کرکے دوسرے لوگوں کو مسائل و مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس کا حل کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم لوگوں کی آزادی کو ختم کرنے کی مہم چلائیں۔ ایسی مہم بے معنی شور وغل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کو یہ آزادی ان کے خالق نے دی ہے۔ اور جو چیز خود خالق نے دی ہو اس کو ہم لوگوں سے چھین نہیں سکتے۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے تدبیر۔ حکیمانہ اصول پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے ضرر سے ممکن حد تک اپنے آپ کو بچانا اور اپنی تعمیر کے مواقع تلاش کرکے اس کے حصول میں لگ جانا۔

مثلاً ٹکراؤ سے اعراض کرنا، چھوٹے نقصان کو برداشت کرلینا، اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا، دوسروں سے مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنے استحکام پر توجہ دینا۔ مسائل کو نظر انداز کرکے مواقع اور امکانات کو استعمال کرنا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعے کوئی شخص اس دنیا میں کامیابی حاصل کرسکے۔

حکیمانہ تدبیر ہر مسئلہ کا حل ہے۔ حکیمانہ تدبیر ہر نقصان سے بچنے کا یقینی نسخہ ہے۔ آپ حکیمانہ تدبیر کو اپنا اصول بنا لیجئے اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

نوٹ :۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو نشر کی گئی۔

مسائل پر صبر

ایک بستی تھی۔ وہاں کے لوگ بہت تیز زبان تھے۔ وہاں دو آدمیوں نے دکان کھولی۔ ایک نوجوان تھا اور دوسرا بوڑھا۔ نوجوان کی دکان جلد ہی ختم ہوگئی۔ بوڑھے کی دکان چلتی رہی۔ آج وہ اس بستی میں سب سے بڑا دولت مند بنا ہوا ہے۔ اب ہر آدمی اس سے ادب کے ساتھ بات کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان دکان دار نے جب دیکھا کہ جو گاہک آتا ہے وہ تیز زبان میں بات کرتا ہے تو اس نے لوگوں کی تیز کلامی کے خلاف جنگ شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف لوگوں کی تیز کلامی تیز دستی تک پہنچ گئی۔ لوگوں نے اس کو پکڑ کر مارا، یہاں تک کہ وہ دکان بند کرکے وہاں سے بھاگ گیا۔

بوڑھے دکان دار کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے لوگوں کی تیز زبان اور درشت کلام کو نظر انداز کیا۔ اس نے اپنی نظر صرف لوگوں کی "جیب" پر رکھی، اور لوگوں کی "زبان" سے اپنی نظر ہٹالی۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی دکان داری میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

یہ دنیا کی کامیابی کا واقعہ ہے۔ آخرت کی کامیابی کا اصول بھی یہی ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے بھی اسی طرح لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص دنیا میں صبر کا طریقہ اختیار نہ کرے اس کے لیے آخرت کی "تجارت" کو کامیاب بنانا ممکن نہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لیے اہلِ ایمان کو جو فرض سونپا گیا ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ اسی فرض کی انجام دہی پر ان کو وہ کامیابی ملنے والی ہے جس کو آخرت کی جنت کہا گیا ہے۔ نیز جب اہل ایمان یہ خدائی ذمہ داری ادا کرتے ہیں تو ابتدائی انعام کے طور پر انھیں دنیا میں بھی سربلندی دیدی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ صبر پر قائم نہ ہوسکیں تو وہ دنیا میں بھی محروم رہتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں، یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان پر وہ لڑ رہے ہیں، اور اس کو غلط طور پر جہاد کہتے ہیں۔ اس دنیا میں لازماً ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی طرف سے زیادتیوں کا تجربہ ہوگا۔ اہلِ ایمان کو لازماً ایسا کرنا ہے کہ وہ مسائل سے اپنی نظریں ہٹالیں اور اپنی ساری توجہ صرف فرض کی ادائگی پر لگادیں۔

اسلام دورِ جدید میں

موجودہ زمانہ کے ماہرین علم الانسان عام طور پر مذہب کا مطالعہ ایک سماجی مظہر کے طور پر کرتے ہیں۔ یہ بات اسلام کے لئے درست نہیں۔ اسلام سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے اسلام ایک الہامی مذہب ہے۔ اور اس بنا پر وہ ابدی طور پر ایک مقدس مذہبی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے اس کی اس مخصوص نوعیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ تو بدلتا رہتا ہے۔ پھر بدلے ہوئے زمانہ میں اسلام کا انطباق کس طرح ہو گا۔ اسلام کو تغیّر پذیر دنیا کے مطابق کس طرح بنایا جائے۔ اس کا جواب قرآن اور دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں، مثلاً بائبل، کا مطالعہ کرکے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح لاتعداد تفصیلات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام زیادہ تر بنیادی قدروں کا مجموعہ ہے اور زمانی تبدیلی کا ٹکراؤ ہمیشہ تفصیلات کے ساتھ پیش آتا ہے نہ کہ بنیادی اقدار کے ساتھ۔

مثلاً اسلام میں توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور توحید ایک اصول کی حیثیت سے بلاشبہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ اسی طرح اسلام میں بعض سنگین سماجی جرائم کے لئے مانع سزا (deterrent punishment) کا قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر حالات کی تبدیلی سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کم از کم اب تک ایسا فرق حقیقی طور پر ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ آج بھی سنگین جرائم کی روک تھام کے لئے مانع سزاؤں کے اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اصلاح (reform) کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ مگر یہ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ اس سلسلہ میں جو مثالیں دی جاتی ہیں ان کا تعلق خود اسلام سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اپنے اضافہ سے ہے۔ اس سے صرف ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اپنے اضافہ سے اسلام کو پاک کرنے کی ضرورت ہے

خود اسلام میں اصلاح یا نظر ثانی کی ضرورت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں مسلم علماء کے ایک طبقہ نے مغربی علوم کو پڑھنے کو غیر اسلامی قرار دیا۔ یہ ان علماء کا غلط فیصلہ تھا۔ اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

یہی معاملہ جمہوریت کا ہے۔ بعد کے زمانہ میں کچھ مسلم قوموں میں بادشاہت کا نظام قائم ہو گیا۔ آج بھی کئی مسلم ملکوں میں ایسا ہی سیاسی نظام پایا جاتا ہے۔ مگر وہ کسی بھی درجہ میں اسلامی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔ وہ ایک سیاسی بگاڑ ہے جو بعد کو مسلم ملکوں میں پیش آیا۔ اسلام کا اصل نمونہ وہ ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں قائم ہوا تھا۔ اور یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے اس ابتدائی دور میں اعلیٰ ترین جمہوری نظام قائم تھا۔ جس کو قرآن میں شورائی نظام کہا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام ہی وہ نظام ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار بادشاہت کو ختم کرکے جمہوریت کی بنیاد پر سیاست کا نظام قائم کیا۔ اس تاریخی حقیقت کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں پیش کی جاتی ہیں ان کا تعلق اسلام میں اصلاح سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اپنے عملی انحرافات میں اصلاح سے ہے۔ اس قسم کا عمل یقینی طور پر ضروری ہے۔ مگر ایسا کرنا زیادہ صحیح لفظوں میں، خارجی اور اجنبی اثرات سے اسلام کو پاک کرنا ہوگا نہ کہ خود اسلام کی اصلاح کرنا۔

تاہم زمانہ کی تبدیلی سے حقیقی اسلام کے لئے بھی بعض اوقات مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ مسائل ہیں جن کے لیے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر یہاں اجتہاد سے مراد اسلام کے حکم کا دوبارہ انطباق (reapplication) ہے نہ کہ اسلام کے اصل احکام میں تبدیلی یا اصلاح۔

مثلاً دور اول کے اسلام میں تاریخوں کے تعین کے لئے چاند کی رویت پر بنیاد رکھی گئی تھی۔ اب فلکیاتی مشاہدہ کے نئے علمی ذرائع دریافت ہونے کے بعد رصد گاہ کے کے ذریعہ کلنڈر کا تعین کیا جائے گا۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اسلام کی اصلاح یا اس کو اپ ڈیٹ

کرنا نہیں ہوگا بلکہ وہ اسلام کے حکم کا از سر نو انطباق ہوگا۔ اس قسم کی مثالوں سے اسلام میں نظر ثانی کے نظریہ کو ثابت کرنا درست نہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کا جو حکم ہے اس کو اکثر اس سلسلہ میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قدیم حالات کے زیر اثر اسلام میں عورت کا سماجی رتبہ کم کیا گیا تھا۔ اب نئے حالات میں ضرورت ہے کہ اسلام کی اس غلطی کو درست کیا جائے۔

مگر یہ یقینی طور پر ایک غلط فہمی کا کیس ہے۔ اس موضوع پر میں نے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو خاتون اسلام کے نام سے چھپ چکی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت کے بارے میں اسلام کا جو حکم ہے اس کا تعلق ایک عملی ضرورت سے ہے نہ کہ ایک جنس کو برتر اور دوسری جنس کو کم تر قرار دینے سے۔ اس معاملہ میں جدت پسند حضرات کا نقطۂ نظر مختصر طور پر equal so equal ہے جب کہ اسلام کا اصول اس معاملہ میں یہ ہے کہ : equal but different

اس معاملہ میں اسلام کی پوزیشن یہ ہے کہ جہاں تک عزت اور احترام کا سوال ہے، اس اعتبار سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ حقوق کے معاملہ میں بھی دونوں کے درمیان برابری کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ تاہم عملی زندگی میں دونوں کا مقام عمل (workplace) بنیادی طور پر الگ الگ ہے۔ عورت کا مقام عمل بنیادی طور پر داخل (indoor) ہے اور مرد کا مقام عمل بنیادی طور پر خارج (outdoor) ہے۔

دونوں کے درمیان یہ تقسیم یقینی طور پر افضل اور غیر افضل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ حیاتیاتی فرق کی بنا پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت پیدائشی طور پر نازک جنس ہے۔ اور مرد پیدائشی طور پر سخت جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے زندگی کے عملی انتظام میں دونوں کے لئے وہ کام دیا گیا ہے جو ان کی پیدائشی ساخت کے مطابق ہو۔ اس قسم کی تقسیم ایک عمومی عملی ضرورت ہے اور وہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ حتی کہ وہ عورت اور عورت اور اسی طرح مرد اور مرد کے درمیان بھی اسی شخصی فرق کی بنا پر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اسی لئے اسلام میں زندگی کا عملی انتظام مقرر کرتے ہوئے دونوں کے لئے وہ کام دیا گیا ہے جو ان کی پیدائشی ساخت کے مطابق ہو۔ اس تقسیم کا تعلق ہرگز قدامت پسندی سے

نہیں ہے۔ وہ صرف فطرت کا اعتراف ہے۔ فطرت نے پیدائشی طور پر عورت اور مرد میں فرق رکھا ہے۔ یہ فطری فرق اتنا حتمی ہے کہ جن سماجوں میں اس تقسیم کو نظری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے وہاں بھی فطرت کے دباؤ کے تحت عملاً یہی تقسیم قائم ہے۔

مثلاً مغربی ملکوں میں عورت کو کامل آزادی دینے کے باوجود مذکورہ تقسیم کو ختم نہ کیا جا سکا۔ آج بھی وہاں کے تمام بڑے بڑے خارجی شعبوں میں مرد ہی کا غلبہ ہے۔ عورت کو نسبتہً صرف ہلکے شعبوں میں جگہ ملی ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنی پیدائشی ساخت کی بنا پر کمپیوٹر کے نازک کی بورڈ پر تو انگلیاں چلا سکتی تھی مگر عورت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کمپیوٹر فیکٹری میں بھاری بھرکم اور مشقت والے کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں اور کچھ آیتیں متشابہ ہیں۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ قرآن کی بہت سی تعلیمات تمثیل اور استعارہ کی زبان میں ہیں اور ان کو حقیقی مفہوم دینے کے لئے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "چور کا ہاتھ کاٹ دو" کے قرآنی حکم کا مطلب ان کے نزدیک لفظی طور پر ہاتھ کاٹنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک مجازی اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو چوری کرنے سے روک دو۔

محکم اور متشابہ کے الفاظ سے یہ استدلال درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کی آیتوں کا تعلق معلوم دنیا سے ہے اور دوسری قسم کی آیتوں کا تعلق غیبی دنیا سے۔

محکم آیتیں معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ چور کی سزا کا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے۔ چنانچہ ایسی آیتوں میں قرآن براہ راست زبان میں کلام کرتا ہے۔

متشابہ آیتیں وہ ہیں جن کا تعلق غیبی دنیا سے ہے۔ یہاں قرآن نے تمثیل کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ کیوں کہ ایسے امور کو براہ راست اسلوب میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ مثلاً "خدا کا ہاتھ" کا لفظ جہاں آتا ہے وہ لفظی معنوں میں نہیں ہے۔ اس سے مراد ہاتھ والی صفت ہے۔ یعنی پکڑ کی طاقت۔

اسلام در اصل فطرت کا نظام ہے۔ فطرت کے جو اصول ساری کائنات میں ابدی طور

پر چل رہے ہیں انھیں اصولوں کو انسانی زندگی میں چسپاں کرنے کا نام اسلام ہے۔ جس طرح عالم فطرت کے اصول ابدی ہیں اسی طرح اسلام کے اصول بھی ابدی ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام میں نظر ثانی کی بات کرنا اتنا ہی غیر متعلق (irrelevent) ہے جتنا کہ قانون فطرت میں نظر ثانی کا مطالبہ کرنا۔

ایک شبہہ

دوسرے مذاہب کے لوگ نہایت آسانی سے ریفارم کے لیے راضی ہو جاتے ہیں، جب کہ اسلام کے علماء ہمیشہ ریفارم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے۔ اس لیے وہ اپنے اندر ریفارم کی اجازت نہیں دیتا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام ایک محفوظ اور غیر محرف مذہب ہے، اور دوسرے مذاہب تبدیلیوں کے نتیجہ میں محرف ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ریفارم کا محتاج نہیں، جب کہ دوسرے مذاہب کا معاملہ یہ ہے کہ ریفارم ان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر بعض مذاہب میں غیر شادی شدہ زندگی کو افضل زندگی بتایا جاتا ہے۔ یہ اصل مذہب میں تحریف ہے۔ اب چونکہ اس تحریف نے ان مذاہب کی نکاح کے بارہ میں تعلیم کو غیر فطری بنا دیا ہے، اس لیے جب ان مذاہب میں ریفارم کی بات کہی جائے تو لوگ فوراً اس کو پسند کرتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا مذہب ایک غیر فطری اور غیر عقلی تعلیم سے پاک ہو جائے گا۔

مگر اسلام میں اس طرح کی غیر فطری تعلیم موجود نہیں۔ اسلام چوں کہ محفوظ مذہب ہے، اس لیے اس طرح کے اضافات بھی اس میں شامل نہ ہو سکے۔ اس معاملہ میں اسلام اور غیر اسلام کا فرق محفوظ اور غیر محفوظ ہونے کی بنا پر ہے نہ کہ جامد اور غیر جامد ہونے کی بنا پر۔

نیا ہندستان ابھر رہا ہے

بیسویں صدی کے خاتمہ پر ملک کے حالات دوبارہ وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں وہ بیسویں صدی کے آغاز میں تھے۔ ان ابتدائی حالات کو استعمال کرکے مہاتما گاندھی نے انڈیا کو پرامن آزادی کا تحفہ دیا۔ اب اگر کچھ باہمت لوگ کھڑے ہو جائیں تو دوبارہ وہ حالات پوری طرح موجود ہو چکے ہیں جن کو استعمال کرکے ملک میں نیا مثبت انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کے لئے ہم سب لوگ پچھلے پچاس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ یعنی ایک ترقی یافتہ اور خوش حال انڈیا کی تعمیر۔

موجودہ صدی کے آغاز میں انڈیا میں آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اس تحریک کا ایک بازو وہ تھا جس کی قیادت مسلم علماء کر رہے تھے اور دوسرا بازو وہ تھا جس کے قائد مسٹر سبھاش چندر بوس تھے۔ تاہم دونوں میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں ہی فوجی طاقت میں اپنے مقاصد کی تکمیل کا راز دیکھ رہے تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ علماء اپنے اس تشدد دانہ خواب کو ترکی اور افغانستان کی مدد سے پورا کرنا چاہتے تھے اور سبھاش چندر بوس اس تشدد دانہ خواب کو جاپان اور جرمنی کی مدد سے۔

تاہم نتائج بتا رہے تھے کہ برٹش ایمپائر کی غیر معمولی فوجی طاقت کے مقابلہ میں دونوں ہی غیر مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ یہی تاریخی وقت ہے جبکہ 1919 میں مہاتما گاندھی ہندستان کے سیاسی نقشہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کا خاص کریڈٹ یہ ہے کہ دوسرے لوگ جس وقت حالات کو صرف اس کی سطح کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، مہاتما گاندھی نے سطح کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دیکھا اور ان کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

مہاتما گاندھی نے اپنے یوروپ اور افریقہ کے قیام کے زمانہ میں جدید سیاسی افکار کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے یہ جانا کہ دور جدید میں ایک نئی طاقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی انسانی تاریخ میں موجود نہ تھی۔ اور وہ ہے نیشنلزم کا نظریہ۔ موجودہ زمانہ میں خود مغرب کے سیاسی افکار کے نتیجہ میں یہ بات مسلمہ طور پر مان لی گئی تھی کہ ہر قوم کو حکومت خود اختیاری

کا غیر مشروط حق حاصل ہے۔ مہاتما گاندھی نے اس نئی لہر کو سمجھا اور ہندستان آکر اس کو استعمال کیا۔

مہاتما گاندھی نے کانگریس میں شامل ہونے کے بعد اعلان کیا کہ کانگریس کے لئے انھیں ایک کروڑ روپیہ کا فنڈ اکٹھا کرنا ہے۔ اس کے لئے دو مہینہ تک وہ پورے ملک کا دورہ کریں گے۔ اس وقت بمبئی میں کپاس کے ایک بڑے تاجر عبد الصمد چھوٹانی تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک کروڑ روپیہ کے لئے دو مہینہ تک سارے انڈیا میں گھومنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو آج ہی ایک کروڑ روپیہ یہیں دے دیتا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے سیٹھ چھوٹانی کی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: مجھے ہندستانی عوام سے ملنا ہے۔ ایک کرور کا فنڈ جمع کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ مہاتما گاندھی ہندستانی عوام کو آزادی کے نام پر موبیلائز کرنا چاہتے تھے۔ وہ پورے ملک میں نیشنلزم کا احساس ابھارنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے انھوں نے، ظاہری اختلاف کے باوجود، خلافت تحریک سے اتحاد کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی مہم کامیاب رہی۔ پورا ہندستان ایک نیشن کے روپ میں جاگ اٹھا جس کا آخری نتیجہ وہ تھا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو برآمد ہوا۔

مہاتما گاندھی کی پر امن نیشنل تحریک سے پہلے یہ صورت حال تھی کہ ایک طرف ہندستانی لیڈروں کے ہتھیار تھے اور دوسری طرف برٹش امپائر کے ہتھیار۔ اس مقابلہ میں برٹش امپائر کو واضح برتری حاصل تھی۔ چنانچہ وہ ہر ٹکراؤ میں کامیاب رہے۔ مگر مہاتما گاندھی نے نیشنلزم کا جذبہ بیدار کر کے یہ کیا کہ چند لاکھ انگریزوں کے مقابلہ میں انھوں نے کروروں ہندستانیوں کو کھڑا کر دیا۔ پچھلے مقابلہ میں اگر انگریزوں کو برتری حاصل تھی تو اب نئے مقابلہ میں ہندستانیوں کو واضح برتری حاصل ہوگئی۔ اس نئی طاقت کے مقابلہ میں انگریز بے بس ہوگیا۔ آخر کار وہ مجبور ہوگیا کہ ہندستان کو چھوڑ کر یہاں سے چلا جائے۔

یہی معاملہ ایک نئی صورت میں آج دوبارہ پورے ملک میں پیدا ہوگیا ہے۔ ہم ایک دور کو ختم کر کے دوسرے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اس کو نہ سمجھنے کی وجہ

سے ابھی تک پرانی بولیاں بول رہے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے دور کا ملبہ اگر سطح کے اوپر ہے تو نئے دور کے امکانات سطح کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ آج دوبارہ گاندھیائی نگاہ کی ضرورت ہے جو اوپری سطح سے گزر کر اندر کی لہروں کو دیکھے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔

نئے دور اور پرانے دور میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو حدّ فاصل کی حیثیت حاصل ہے۔ ۶ دسمبر سے پہلے ہندستان کے دو بڑے فرقے، ہندو اور مسلمان، ٹکراؤ کے راستے پر چل رہے تھے۔ آخری زمانہ میں پہنچ کر اس ٹکراؤ کی علامت اجودھیا بن گیا۔ ہندو کی نظریں رام مندر پر اٹک گئیں اور ہر طرف یہ نعرہ سنائی دینے لگا کہ "مندر وہیں بنائیں گے"۔

دوسری طرف مسلمانوں نے بعض نام نہاد قائدین کی غیر دانشمندانہ رہنمائی کے نتیجہ میں اجودھیا کی بابری مسجد کو ملّت کے وقار حتی کہ خود اسلام کی زندگی اور موت کی علامت سمجھ لیا۔ دونوں طرف سے دھواں دھار تحریک چل پڑی۔ ایک طرف اگر رتھ یاترا کی دھوم تھی تو دوسری طرف ریلی اور مارچ کی دھوم۔ ان دوطرفہ تحریکوں نے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کیا بلکہ ان کے حق میں کسی کا یہ قول مکمل طور پر صحیح ثابت ہوا کہ جلسہ اور جلوس کے ہنگامے گرمی زیادہ پیدا کرتے ہیں اور روشنی کم۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس سیاست کا آخری انجام یہ ہوا کہ اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو کچھ بپھرے ہوئے ہندوؤں کے ہاتھوں ڈھادی گئی۔ مزید یہ کہ قدیم عمارت کا ملبہ مکمل طور پر وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر تعمیر کر دیا گیا جس میں مورتیاں رکھ کر باقاعدہ پوجا پاٹ کا عمل جاری ہے۔

۶ دسمبر کو جب انہدام کا یہ واقعہ ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کو آغاز سمجھا۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ اب ہندستان میں تخریب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ایسا پیش نہیں آیا۔ راقم الحروف نے ۶ دسمبر کے حادثہ کے بعد یہ فارمولا پیش کیا تھا کہ اب دونوں فرقوں کو ایسا کرنا چاہئے کہ ایک طرف مسلمان بابری مسجد کے معاملہ پر اپنا ایجی ٹیشن ختم کر دیں۔ اور دوسری طرف ہندو اس کے علاوہ دوسری مسجدوں کے معاملہ کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیں۔

عملی حالات کے اعتبار سے دیکھئے تو آج بطور واقعہ یہی صورت حال قائم ہو چکی ہے۔ ایک طرف مسلم عوام بابری مسجد کے معاملہ پر خاموش ہیں۔ دوسری طرف ہندو عوام اب کسی اور مسجد کے معاملہ کو عملاً بھلا چکے ہیں۔ حتی کہ جو پارٹی "مسجد گراؤ مندر بناؤ" کی تحریک لیکر اٹھی تھی خود اس نے اعلان کر دیا ہے کہ اب اس نے مندر۔ مسجد اشو کو چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ سوشل ریفارم پر اپنی ساری توجہ صرف کرے گی۔

اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ دونوں طرف کے کچھ ناکام لیڈر اپنے وجود کا ثبوت کے لئے کبھی کبھی اخبار میں بیان چھپواتے ہیں یا کسی سرکاری عمارت کے سامنے چند آدمی دھرنا دے کر ظاہر کرتے ہیں کہ مندر۔ مسجد کا اشو ابھی زندہ ہے۔ مگر یہ واقعہ واضح طور پر ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے کہ دونوں فرقوں کے لیڈروں میں سے کوئی بھی کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ ہندو عوام یا مسلم عوام کو دوبارہ اس مذہبی اشو پر کھڑا کر سکے۔ یا انھیں سڑکوں پر لا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ تخریب کی ایک حد ہے۔ اس دنیا میں ہر تخریب اپنی انتہا پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں جو چیز مسلسل باقی رہنے والی ہے وہ صرف تعمیر ہے نہ کہ تخریب۔ ۶ دسمبر کے بعد فطرت کا یہ قانون ہمارے ملک میں پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔ اب دونوں فرقوں کے عوام نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ان کے حقیقی مسائل دوسرے ہیں۔ اور "تصحیح تاریخ" کے نام سے مسجد۔ مندر کا جھگڑا اٹھانا ان حقیقی مسائل کو صرف بڑھانا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو حل نہیں کرتا۔

یہ حقیقی مسائل کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ملک میں امن ہو۔ ہر ایک کو انصاف ملے۔ ہر ایک کو اپنی تعمیر کے لئے محنت کرنے کے کھلے مواقع حاصل ہوں۔ ملک اقتصادی شعبوں میں ترقی کرے تاکہ ہم دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک ترقی یافتہ قوم کا درجہ حاصل کر سکیں۔

قدیم حالات کے ملبہ کے نیچے یہ نئے حالات آج پوری طرح موجود ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ سطح کی چیزوں سے نگاہ کو ہٹا کر اندر کے امکانات کو دیکھا جائے۔ اور انھیں بھرپور طور پر استعمال کیا جائے۔

آج ملک کی تعمیر نو کے لئے حالات پوری طرح سازگار ہیں۔ آسام اور پنجاب کے سرحدی جھگڑے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ کشمیر میں علیحدگی پسندی کی تحریک دم توڑ رہی ہے، موجودہ حکومت کی لبرلائزیشن کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندستان دوبارہ انٹرنیشنل نقشہ پر نمایاں ہو رہا ہے۔ حالیہ انتخابات نے بتایا ہے کہ ہندستان کا ووٹر اب نعروں کے فریب میں آنے والا نہیں ہے۔ وہ اب حقیقی اشوز کو اہمیت دے گا نہ کہ جذباتی نعروں کو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑے جو آزادی کے بعد سے مسلسل جاری تھے، وہ اب اجودھیا کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکے ہیں۔

یہ سب انقلابی تبدیلیوں کی علامتیں ہیں۔ اب برصغیر میں ایک نیا ہندستان ابھر رہا ہے۔ نئے ہندستان کے بننے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور فطرت کا یہ قانون ہے کہ جس عمل کا آغاز ہو جائے وہ اپنی تکمیل کی منزل تک بھی ضرور پہنچے۔ اور ہندستان یقینی طور پر اس عمومی قانون میں کوئی استثناء نہیں۔

لفظ اور معنی

قدیم عرب میں بہت سے بُت تھے۔ ایک بڑے بت کا نام "منات" تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عرب کا منات اور ہندستان کا سومنات دونوں ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں۔ حالانکہ صوتی مناسبت کے سوا اس نظریہ کے حق میں کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں۔

اسی طرح بعض عرب سیاح جب ہندستان آئے اور انھوں نے یہاں "برھما" کا لفظ سنا تو انھوں نے یہ خیال قائم کرلیا کہ برھما اور ابراہیم دونوں کی اصل ایک ہے۔ اور ہندستان کے برہمن "ابراہیم" کی اولاد ہیں۔ علامہ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اس مسئلہ پر کلام ہے اور لکھا ہے کہ یہ محض ایک خیالی بات ہے، اس کے حق میں تاریخی شواہد موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق علم سے یا علمی استدلال سے نہیں۔ یہ شاعری کی اس صنف کو تاریخ میں استعمال کرنے کی کوشش ہے جس کو "مناسبتِ لفظی" کہا جاتا ہے۔

مناسبت لفظی کا یہ طریقہ صرف لطیفہ گو لوگوں کے یہاں رائج نہیں۔ بہت سے لوگ حقیقی معاملات میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کوئی شخص ایک مذہبی نظریہ گھڑتا ہے اور اس کے حق میں اس قسم کی لفظی دلیل دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی بات کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔ کوئی شخص ایک سیاسی پروگرام بناتا ہے اور اس پر پوری ایک قوم کو دوڑا دیتا ہے۔ حالاں کہ اس سیاسی پروگرام کے حق میں ایک لفظی نکتہ کے سوا کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں ہوتی۔

الفاظ کے مجموعہ سے معنویت کا خزانہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اس قسم کی تحریکوں اور اس قسم کے ہنگاموں کا کوئی حقیقی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اور نہ اب تک ان کا کوئی نتیجہ نکلا ہے۔

یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ لفظی نکتوں اور معنوی حقیقتوں میں فرق کرے۔ وہ لفظی نکتوں کی بنیاد پر کوئی پروگرام نہ بنائے۔ بلکہ حقائق کی بنیاد پر غور وفکر کے بعد اپنا پروگرام ترتیب دے۔

حقیقی کلام وہ ہے جو مناسبت معنوی پر مبنی ہو نہ کہ مناسبت لفظی پر۔ سچا عمل وہ ہے جو حقائق کی بنیاد پر انجام دیا جائے نہ کہ تخیلات کی بنیاد پر۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس قسم کے سیکڑوں عرب نوجوان مختلف عرب ملکوں میں پیدا ہو چکے ہیں جو الرسالہ مشن سے شیفتگی کی حد تک تعلق رکھتے ہیں۔ الرسالہ مشن اردو میں جاری ہوا۔ اس کا لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں ہے۔ یہ عرب نوجوان اردو سے مکمل طور پر ناواقف ہیں، اس کے باوجود انھوں نے الرسالہ مشن کو جتنا زیادہ سمجھا ہے اور جتنا اس کو پایا ہے، اس کی مثال اردو داں لوگوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ان عرب نوجوانوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کر دی ہیں۔ اور مختلف ملکوں میں خاموشی کے ساتھ اس مشن کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ اس قسم کا ایک بڑا حلقہ قاہرہ میں ہے۔ وہ لوگ الرسالہ کے منتخب مضامین کا عربی میں ترجمہ کرواتے ہیں اور اس کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر عربوں کے درمیان پھیلا رہے ھیں۔ انگلینڈ میں مقیم عرب نوجوان یہی کام انگریزی کتابچوں کی صورت میں کر رہے ہیں۔ اسی طرح اور کئی ملک میں یہ کام خالص مثبت انداز میں جاری ہے۔

العارف عبدالسلام احمد (۳۳ سال) ایک عرب نوجوان ہیں۔ ان کی تعلیم برطانیہ (Red Car, Middlesborough) میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۲ اگست ۱۹۹۲ کو وہ لیسٹر میں تھے۔ وہاں مشہور مصری عالم دکتور محمد صلاح الصاوی ایک مؤتمر میں اپنا مقالہ پیش کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہاں ایک پاکستانی نوجوان ان سے بحث کرنے لگا کہ اسلام کی حاکمیت قائم کرنا امت پر فرض ہے اور یہی امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ دکتور صاوی نے کہا: الحاکمیة لیست بآیة ولا حدیث ولکنها اجتهادُ بشرٍ عُرضة للخطأ (حاکمیت کا لفظ نہ آیت ہے اور نہ حدیث۔ بلکہ وہ ایک انسان کا اجتہاد ہے جو غلطی کا شکار ہو سکتا ہے)

وگن میں مجھے دکتور صلاح الصاوی کی کتاب قضیة تطبیق الشریعة فی العالم الاسلامی ملی۔ اس کے باب رابع کا عنوان ہے: اجماع الامة علی کفر من أبی التحاکم الی الکتاب والسنة۔ اس باب میں دکتور یوسف القرضاوی کا ایک اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

بل ان العلمانی الذی یرفض مبدأ تحکیم الشریعة من الاساس لیس له من الاسلام الا اسمه۔ وهو مرتد عن الاسلام بیقین۔ یجب ان یستتاب وتنزاح عنه

الشبهة وقام عليه الحجة - والاحكم القضاء عليه بالردة وجُرّد من انتماءه الى الاسلام او سحبت منه الجنسية الاسلامية - وفرق بينه وبين زوجه وولده - وجرت عليه احكام المرتدين المارقين فى الحياة وبعد الوفاة (صفحه ۴۶)

علمانی (سیکولر) کا مذکورہ حکم اس وقت ہے جب کہ علمانیت (سیکولرزم) کو ایک اعتقادی چیز مانا جائے۔ مگر سیکولرزم اصلاً ایک عملی تدبیر ہے۔ سیکولرزم کا عمومی مطلب یہ ہے کہ کثیر مذہبی سماج میں ریاست اس بات کی پابندی قبول کرلے کہ وہ مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گی۔ گویا سیکولرزم صرف ایک سیاسی مسلک ہے نہ کہ کوئی مذہبی عقیدہ۔

۱۹ ستمبر کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے اس کا شیشہ توڑ دیا ہے۔ میں نے جاکر دیکھا تو ڈرائیور کی سیٹ کے پاس والا کھڑکی کا شیشہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں بے روزگار لڑکے اکثر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ لڑکے عام طور پر شراب اور ڈرگ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے پاس اپنی بری عادتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو وہ چوری کرتے ہیں۔ مذکورہ گاڑی کا شیشہ کسی لڑکے نے اس لئے توڑا تھا کہ وہ اس کے اندر لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو نکال لے اور پھر اس کو بیچ کر کچھ رقم حاصل کرے۔

جدید مغربی زندگی میں جہاں بہت سی مادی اور اخلاقی خوبیاں ہیں، ان میں بعض ایسی برائیاں پائی جاتی ہیں جن کا مشاہدہ مشرقی ملکوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ مکانوں کے سامنے برائے فروخت (for sale) کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت برطانیہ میں اقتصادی گراوٹ (recession) کا دور ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنے مکانوں کی قسط بینکوں کو ادا کرنے میں اپنے کو عاجز پا رہے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے مکانوں کو اپنے بینکوں کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ کسی اور گاہک کو تلاش کرکے مکان ان کے حوالے کرسکیں۔

واضح ہو کہ یہاں مکانات عام طور پر بینکوں کے قرض کی بنیاد پر خریدے جاتے ہیں۔

ایک انگریز سے گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے

موجودہ حالات میں ذہنی سکون حاصل ہے :

Do you feel you are enjoying mental peace.

اس نے مسکرا کر کہا کہ ہماری زندگی اتنی زیادہ مشینی ہو چکی ہے کہ ہمارے لئے یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ہم میں سے اکثر لوگوں کو شاید ہی کبھی یہ موقع ملتا ہو کہ وہ آپ جیسے لوگوں کی طرح فلسفیانہ انداز میں سوچیں کہ انھیں پیس آف مائنڈ حاصل ہے یا نہیں۔

ترقی کے ساتھ بے ترقی کا کیسا عجیب نمونہ مغربی ملکوں میں پایا جاتا ہے۔

برطانیہ میں آپ جس سڑک یا جس مقام پر نکلیں ہر جگہ کتوں کا منظر دکھائی دے گا۔ مرد اور عورت کتے کی رسی اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ۲۰ ستمبر کو میں نے ایک تعلیم یافتہ انگریز سے کہا معاف کیجئے، کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کتوں سے کیوں اتنا زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

انگریز کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا۔ میں نے فرانس کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فرانس میں سات ملین آدمی کتا پالے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک سروے کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندانی انتشار اور انڈسٹریل انقلاب کے نتیجہ میں لوگوں نے انسان کے اندر اپنا اعتماد کھو دیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ بیٹا اور بیٹی بھی ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ جب کہ کتا اپنی وفاداری کی فطرت کی بنا پر انھیں یہ اعتماد دے رہا تھا۔ کتے کے اندر وہ اپنی اس مطلوب چیز کو پا رہے تھے جس کو وہ موجودہ انسان حتی کہ اپنے عزیزوں میں بھی نہیں پاتے۔ اس لئے وہ اپنی مطلوب فطرت کی تسکین کے لئے کتا پالنے لگے ہیں۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا کہ یہی معاملہ غالباً برطانیہ کے لوگوں کا بھی ہے۔

میں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ کتا ری ایکٹ نہیں کرتا، جب کہ انسان ری ایکٹ کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا انسان کے مقابلہ میں ایک غیر اختیاری مخلوق ہے۔ انسان با اختیار مخلوق ہونے کی وجہ سے ری ایکٹ کرتا ہے جو آپ کے لئے ناگوار ہے۔ جب کہ کتا اس طرح ری ایکٹ نہیں کرتا اس لئے اس کے اور آپ کے درمیان کامپلکس پیدا نہیں ہوتا۔

پھر میں نے قرآن کی آیت افغیر دین اللہ یبغون و لہ اسلم من فی السماوات والارض

طوعاً و کرھاً کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی اسکیم میں انسان اور حیوان دونوں سے ایک ہی دین کی پیروی مطلوب ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جس اصول کی پیروی حیوان جبلت (instinct) کے تحت مجبورانہ کر رہے ہیں، اس دین کی پیروی انسان اختیارانہ کرنے لگے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ اسلام کا مطلب دراصل دین فطرت کی پیروی ہے۔ اگر انسان اسی طرح دین فطرت پر آجائے جس طرح حیوان دین فطرت پر قائم ہے تو اس کے بعد انسان سے ری ایکشن کا طریقہ چھوٹ جائے گا۔ اس کے بعد انسان بھی آپ کے لئے مجبوب بن جائے گا جس طرح حیوان آپ کے لئے مجبوب بنا ہوا ہے، کیوں کہ انسان ہر اعتبار سے حیوان کے مقابلہ میں افضل ہے۔ مثلاً ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خیالات کا اکسچینج ہوتا ہے، جب کہ انسان اور حیوان کے درمیان اس قسم کا اکسچینج ممکن نہیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ میں مانچسٹر میں ایک بڑی اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے علماء شریک ہوئے۔ اس کا موضوع الاسلام والنظام العالمی الجدید تھا۔ طارق حسین الکردی (۳۰ سال) مانچسٹر کے قریب وگن میں رہتے ہیں۔ وہ موتمر میں شریک نہیں تھے۔ البتہ اس کا ویڈیو ٹیپ انھوں نے دیکھا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک عرب محاضر نے اپنے محاضرہ میں بتایا کہ مغرب اسلام کا دشمن ہے۔ وہ اسلام کو تباہ کر دینا چاہتا ہے (ان الغرب یرید تدمیر الاسلام) محاضرہ کے بعد حاضرین میں سے ایک نوجوان کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ کہتے ہیں مغرب اسلام کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے لئے کیسے یہ ممکن ہوا کہ ہم ایک مغربی ملک میں اتنے بڑے پیمانہ پر موجودہ اسلامی کانفرنس اور اس طرح کی دوسری کانفرنسیں منعقد کریں۔ محاضر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم اس راز کو نہیں جانتے۔ یہ مغرب کی ایک گہری چال ہے۔ یہ مغرب کی فراخ دلی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی سوچی سمجھی اسٹریٹیجی کا نتیجہ ہے۔

میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہا کہ استغفراللہ۔ محاضر اگر واقعی اسلام پسند تھے تو اس سوال کے بعد انھیں ڈھ پڑنا چاہئے تھا اور چیخ کر کہنا چاہئے تھا: کل الناس اعلم منی حتی العجائز سیدنا عمر کی یہ سنت بتاتی ہے کہ مومن کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی غلطی بتائی

تو وہ اس کے عدم اعتراف کو افورڈ نہ کر سکے۔ میں نے کہا: المومن لا یستطیع ان یتحمل عدم الاعتراف۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا: حارب۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات عرض کروں۔ پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح علی ابن ابی طالب سے کیا۔ ان کے یہاں ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے پوچھا کہ اس کا نام کیا رکھا۔ انھوں نے کہا حرب۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اس کا نام حسن رکھو۔

میں نے کہا کہ آپ کا نام ما انا علیہ واصحابی کے خلاف ہے۔ جس نام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کر دیا اس کو آپ دوبارہ پسند کر رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ میں دور حرب ختم ہوا، اور دور امن شروع ہوا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم زعماء اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے دور حرب کو ختم کر کے تاریخ انسانی میں دور امن شروع کیا۔ اور یہ مسلم زعماء دوبارہ تاریخ انسانی میں دور حرب واپس لانا چاہتے ہیں۔

۲۰ ستمبر کو عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ کے بارہ میں سوال کیا گیا۔ اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا میں کبھی یکساں حالات نہیں ہو سکتے۔ یکساں حالات صرف جنت کے ماحول میں ممکن ہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں ہمیشہ نشیب و فراز کے حالات پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس لئے قرآن و سنت میں ہر طرح کے احکام ہیں تاکہ اہل اسلام اپنے آپ کو جن حالات میں پائیں اس کے مطابق عمل کر سکیں۔

مثلاً اس دنیا میں اہل ایمان کو کبھی مسجد میں معتدل حالات میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھیں جنگ کے میدان میں نماز پڑھنا پڑتا ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں اگر عام حالات میں نماز کی ادائگی کا حکم بتایا گیا تو اسی کے ساتھ جنگ کے میدان کے لئے صلاۃ خوف کا حکم بھی بتا دیا گیا۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کے لئے موجودہ دنیا میں مختلف حالات ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے

سنت رسول کا مطالعہ کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی وسیع تر تقسیم میں تین قسموں میں نظر آئے گی۔ اول، مکی دور۔ یہ وہ دور ہے جب کہ اہل اسلام کے ہاتھ میں سیاسی قوت نہیں تھی۔ دوم مدنی دور کا نصف اول۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مدینہ میں دو متوازی نظام قائم تھا۔ اس کا اقرار صحیفہ مدینہ میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے: للیہود دینہم وللمسلمین دینہم۔ سوم، مدنی دور کا نصف ثانی۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ماحول میں اہل اسلام کا غیر مشترک اقتدار قائم ہو گیا۔

میں نے کہا کہ سورہ النساء کی مذکورہ آیت (یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت) مدنی دور کے نصف اول والے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ آج اکثر ملکوں میں یہی صورت حال ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ایک طرف برٹش کورٹ ہے۔ دوسری طرف مساجد اور اسلامی مراکز کے علماء ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ العلماء ورثۃ الانبیاء۔ برٹش کورٹ گویا کعب بن اشرف کے مماثل ہے۔ اور علماء (یا دار الافتاء) رسول کے نمائندہ۔ اب مذکورہ آیت کے مطابق مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ ان کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہو تو وہ اپنے معاملہ کو ملکی عدالت میں نہ لے جائیں۔ بلکہ علماء یا دار الافتاء کے سامنے رکھ کر اس کا شرعی فیصلہ کریں اور قرآن وسنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیا جائے اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

لندن میں مقیم ایک ہندستانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے میں آپ کا رسالہ پڑھتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے خلاف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور آپ کے خلاف مضامین چھپ رہے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد میں آپ کے مشن کے بارہ میں مشتبہ ہو گیا اور آپ کی تحریروں کو پڑھنا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ مضامین تو ہر ایک کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر جماعت کے خلاف بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ حتی کہ اکابر میں سے کوئی بھی شاید ہی اس قسم کی تحریروں سے بچا ہو۔ اس وقت میرے پاس محمد سرور بن نایف زین العابدین کی کتاب الحکم بغیر ما انزل اللہ واہل الغلو تھی۔ یہ کتاب دار القلم، برمنگھم (Tel. 021-449 4422) نے چھاپی ہے۔ میں نے اس کا صفحہ ۲۰۸ دکھایا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے امام النووی کے بارہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، حضرت ابوذر پر اور اسلام پر

جھوٹ باندھا ہے (لقد کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابی ذر وعلی الاسلام) اس کو دکھانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس الزام کو دیکھنے کے بعد آپ امام نووی کی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔

ایک عرب نوجوان نے کہا کہ "قرآن عرب کی زبان میں اترا ہے" میں نے کہا کہ یہ نہ کہئے، بلکہ یہ کہئے کہ قرآن انسان کی زبان میں اترا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ قرآن عربوں کی زبان میں اترا ہے تو آپ قرآن کے ۵۰ فیصد معانی سے محروم رہ جائیں گے۔

برطانی نومسلموں کے بارہ میں ایک کتاب نظر سے گزری۔ اس میں برطانی نومسلموں کے تاثرات ان کی تصویروں کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ اس کا نام و پتہ یہ ہے :

Islam Our Choice, compiled by Dr S.A. Khulus,
The Woking Muslim Mission & Literary Trust,
The Shah Jehan Mosque, Woking, Surrey, England.

۳۶۰ صفحہ کی اس کتاب میں سیکڑوں نومسلموں کے تاثرات نقل کئے گئے ہیں۔ کچھ لمبے ہیں اور کچھ صرف چند سطروں پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۱۳۹ پر جیو ٹائلر (Geo T. Tyler) کا ایک مختصر اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ میں نے مقدس قرآن کا مطالعہ کیا۔ اسلام ایک صاف اور خوبصورت مذہب ہے۔ وہ نجات کو اپنی محنت کا نتیجہ قرار دیتا ہے نہ کہ ایک خدا کے بیٹے کے سولی پر چڑھنے کا نتیجہ :

I studied the Holy Qur'an. Islam is a clean, wholesome faith and makes the salvation of man his own duty, and not dependent on the sacrifice of a 'Son of God.' (p. 139)

مانچسٹر میں ایک مسیحی فادر سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے مذکورہ بات پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب محرف ہو چکے ہیں۔ یہ تو گویا خدا کو چیلنج دینا ہے۔ کیوں کہ یہ آپ لوگ بھی مانتے ہیں کہ وہ مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ پھر جب وہ خدائی مذہب تھے تو خدا نے کیسے گوارا کیا کہ اس کے بھیجے ہوئے تمام مذاہب محرف ہو جائیں اور صرف ایک غیر محرف مذہب دنیا میں باقی رہے۔

میں نے کہا کہ یہ خدا کی ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کی ہے۔ اس طرح اس نے یہ انتظام کر دیا کہ ہمارے لئے چوائس کا مسئلہ نہ رہے۔ ہم کو یہ سوچنا نہ پڑے کہ یہ مذہب صحیح ہے یا وہ مذہب صحیح ہے۔ میدان میں ایک ہی صحیح مذہب ہو اور کسی فتنہ میں مبتلا ہوئے بغیر ہم اس واحد صحیح مذہب کو اختیار کر لیں۔ اس طرح خدا نے ہم کو ایک نازک امتحان سے بچا لیا ہے جس پر ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

۲۱ ستمبر کی صبح کو میں ایک عرب نوجوان کی رہنمائی میں وگن کی مسجد میں گیا۔ یہ یہاں کی واحد مسجد ہے اور اس کا نام مسجد طوبیٰ ہے۔ یہ ہال کی مانند ہے۔ میں نے اس کے احاطہ کی پیمائش کی تو لمبائی میں وہ ۶۱ قدم اور چوڑائی میں ۴۵ قدم تھی۔ مسجد سادہ مگر خوبصورت تھی۔ اس کے اندر عربی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔ کئی الماریوں میں قرینہ کے ساتھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں ابن الجوزی البغدادی (۵۹۷-۵۰۸ ھ) کی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر (نو جلد) بھی موجود تھی۔ اس کو المکتب الاسلامی (ص ب 377/۱۱، بیروت) نے ۱۹۸۴ء میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جس میں نماز ادا کی جاتی ہے وہ لمبائی میں ۲۵ قدم اور چوڑائی میں ۱۲ قدم تھا۔

مسجد میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ نماز کے بعد کی دعا کے دوران میں نے کہا: رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ حالت سفر میں نکلے تھے۔ میں بھی اس وقت حالت سفر میں ہوں۔ اسی اشتراک کی بنا پر بے اختیارانہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہو گئے۔

مجھے بتایا گیا کہ یہاں ابتداءً چرچ تھا۔ چرچ والوں نے اس کو فروخت کر دیا۔ اس کے بعد یہ عمارت ایک انگریز کی ملکیت میں چلی گئی۔ بعد کو اس انگریز نے اس کو فروخت کرنا چاہا۔ مقامی مسلمانوں نے تقریباً ۲۰ ہزار پونڈ مسجد کے لئے جمع کئے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اس عمارت کو خرید کر اس کو مسجد کی صورت دے دیں۔ مگر عین اسی وقت ایک اور انگریز خریدار پیدا ہو گیا۔ وہ دگنا قیمت ۴۰ ہزار پونڈ دینے کے لئے تیار تھا۔ مگر جب عمارت کے مالک کو جو مسیحی تھا، یہ بتایا گیا کہ مسلمان اس کو خرید کر وہاں مسجد بنانا چاہتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور انگریز کو ۴۰ ہزار پونڈ میں دینے کے بجائے مسلمانوں کو صرف ۲۰ ہزار پونڈ میں دے دیا۔ ایسا ہی ایک اور قصہ لندن میں میرے علم

میں آیا۔

مذکورہ مسیحی نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے کہا کہ یہ عمارت پہلے ایک عبادت خانہ تھی۔ اس لئے اس کا سب سے بہتر استعمال یہ ہے کہ اس کو دوبارہ عبادت خانہ بنایا جائے۔ اس لئے میں اس کو کم قیمت کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ کیوں کہ انھوں نے بتایا کہ وہ اس کو عبادت خانہ بنانا چاہتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو ایک برطانی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پچھلے سال اسلام قبول کیا ہے۔ میں نے ان سے تعلیم کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے یہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دوران انھیں اسلام سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور اسلام میں سرگرم ہو گئے۔

میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی دریافت نے آپ کے اندر ایک نیا جوش پیدا کیا اور اسلام کو سیکھنے کا جذبہ آپ کے اندر ابھر آیا۔ مگر یہ کام آپ کو ساتھ ساتھ کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ آپ ایک طرف کالج اور یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کریں اور اسی کے ساتھ مساجد اور اسلامی مراکز سے وابستہ ہو کر اسلامی تربیت اور اسلامی معلومات حاصل کریں۔ آپ ابھی ابتدائی عمر میں ہیں۔ آپ کو اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ آپ کو اپنے سامنے دو نشانہ رکھنا چاہئے نہ کہ صرف ایک نشانہ۔

اس گفتگو کے وقت ایک عرب نوجوان ریاض عبد السلام احمد (۲۸ سال) موجود تھے۔ وہ برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ انھوں نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ عربوں میں ایک مثل ہے کہ ایک پتھر سے دو گوریا کا شکار کرو (یضرب عصفورین بحجر واحد) میں نے کہا کہ یہ نہایت صحیح مثل ہے اور آپ لوگوں کو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے، نہ یہ کہ تعلیم کو چھوڑ کر آپ صرف تربیت کے لئے دوڑنا شروع کر دیں۔

اس وقت مجلس میں کئی عرب نوجوان تھے۔ میں نے معاملہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل

ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال ۶۰) اس آیت میں ترھبون کا لفظ بیحد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت کے اندر ارہاب کی صفت ہونی چاہئے۔ گویا قوت وہ ہے جو قوت مرہبہ ہو۔

میں نے کہا کہ اس وقت عالم اسلام میں بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ کیا اہل عالم اس سے خوف زدہ ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بعض نادان لوگ یورپ یا امریکہ کے کسی اخبار میں مسلم فنڈ منٹلزم یا صحوۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی مضمون پڑھ کر کہتے ہیں کہ دیکھو، مغرب ہماری ان سرگرمیوں سے خوف زدہ ہے۔ میں نے ایک امریکی سے ایک بار اس بارہ میں گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ کم سے کم کوئی ازعاج (nuisance) تو پیدا کر ہی سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہم کو کیا درجہ دے رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ ہمیں موجودہ دور کو سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں جو چیز قوت مرہبہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ صرف علم ہے۔ خاص طور پر سائنسی علم۔ اس لئے اس آیت کے مطابق، مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ وقت کی قوت مرہبہ (علم) حاصل کریں۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں ہم کو باوزن حیثیت نہیں مل سکتی۔

ستمبر ۱۹۹۲ کی ۲۳ تاریخ ہے۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کے اوپر کے کمرہ میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان ایک شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گاڑیوں کا لامتناہی سیلاب بہہ رہا ہے سامنے تکونی چھتوں (۸) کے مکانات کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف پارک ہے جس میں دور تک درختوں کا منظر پھیلا ہوا ہے۔ اپنی کھڑکی سے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ یہی وہ قوم ہے جو کبھی برطانیہ عظمی کہی جاتی تھی۔ اس نے دنیا کے اتنے بڑے حصہ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ کہا جانے لگا کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس قوم کی وہ کون سی صفت تھی جس نے اس کو اتنے وسیع رقبہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کرنے کے قابل بنایا۔ اتنے میں سڑک پر ایک معمر خاتون ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر سبز رنگ کا کپڑا ہے۔ اپنے ہاتھ میں وہ لاٹھی جیسی ایک لمبی لکڑی لئے ہوئے ہے۔ اس لکڑی کے سرے پر ایک گول تختہ جڑا ہے۔ اس تختہ پر جلی حرفوں میں نیچے اوپر لکھا ہوا ہے:

Stop/Student

یہ معمر خاتون اس نشان کو لے کر سڑک کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اسکول کے بچے جو سب کے سب سفید فام ہیں، تیزی سے سڑک کو پار کرتے ہیں۔ خاتون اپنا یہ کام سڑک کی دونوں سائڈ میں کرتی ہے اور پھر تیزی سے اپنی لکڑی کا رخ الٹا کرکے دوبارہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ مزید آنے والے بچوں کی مدد کر سکے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سڑکوں پر جگہ جگہ یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کم آمدنی والی معمر خواتین معمولی معاوضہ پر یہ کام کرتی ہیں۔ ان کے جسم کا سبزی مائل کپڑا ان کی اس حیثیت کی علامت ہوتا ہے۔ صبح کے وقت جب بچے اسکول جاتے ہیں اور دوپہر بعد جب وہ لوٹتے ہیں، دونوں وقت یہ خواتین سڑک پر آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے نشان کو دیکھ کر تمام سواریاں فوراً رک جاتی ہیں۔ ایسی خاتون کو اسکول کراسنگ گارڈ کہا جاتا ہے۔

مذکورہ خاتون کو اپنے کام کی ادائگی میں بیک وقت دو پہلوؤں کا لحاظ کرنا تھا۔ ایک طرف گاڑیوں کا اور دوسری طرف بچوں کا۔ بوڑھی خاتون نے اس کام کو اتنی پھرتی، اتنی باقاعدگی اور اتنے منظم انداز میں کیا کہ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ انگریزوں کی عالمی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے اپنی پوری قوم، حتی کہ عام مردوں اور عورتوں تک کے اندر ڈسپلن کی صلاحیت کمال درجہ میں پیدا کر دی۔

دوسری عالمی جنگ (۴۵ - ۱۹۳۹) کے دوران سر ونسٹن چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ عام طور پر شدت پسند لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں بہت سی قابل قدر مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بوڑھے برطانی شخص نے مجھے بتایا کہ چرچل نے دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں برطانی قوم کو جو ماٹو دیا وہ یہ تھا ـــــ سب کچھ میرے اوپر منحصر ہے :

It all depends on me.

یہ بلاشبہ ایک بہترین ماٹو ہے۔ یہ جنگ اور امن دونوں حالتوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ میرے بھائی عبد المجیط خاں انجینئر نے بتایا کہ ایک بار وہ چنڈی گڑھ کے ایک ٹریننگ کیمپ میں شریک ہوئے۔ یہ کیمپ پالی ٹکنیک کے پرنسپلوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور ایک انگریز پروفیسر کو اس میں لکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح ایک ہندستانی منسٹر کو کرنا تھا۔

منسٹر صاحب جب مائک پر آئے تو اچانک بجلی چلی گئی اور لاؤڈ اسپیکر نے کام کرنا بند کر دیا۔ جلسہ گاہ میں متبادل انتظام کے طور پر بیٹری رکھی نہیں گئی تھی۔ البتہ کالج کے قریبی ورک شاپ میں بیٹری موجود تھی۔

جب یہ حادثہ ہوا تو زیر تربیت پرنسپل صاحبان کالج کے کسی چپراسی یا کسی ورکر کو تلاش کرنے لگے تاکہ اس کو بھیج کر ورکشاپ سے بیٹری منگوا سکیں۔ لیکن انگریز پروفیسر کو جیسے ہی صورت حال کا علم ہوا وہ خود بھاگ کر ورکشاپ پہنچا۔ بھاری بیٹری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے نظام سے جوڑ کر اس کو چند منٹ میں چلا دیا۔

کسی قوم کے افراد کا یہی مزاج اس قوم کی اجتماعی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ افراد کے اندر یہ اسپرٹ جتنی زیادہ پائی جائے گی، اتنی ہی زیادہ وہ قوم ترقی کرے گی۔

میری قیام گاہ کے قریب ایک اسکول (Hawkley Hall High School) تھا۔ میں روزانہ صبح اور شام یہاں ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ ۲۳ ستمبر کو موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ اسکول کے سامنے کھلی جگہ پر ٹہل رہا تھا۔ اچانک پولیس کی کار آکر وہاں کھڑی ہوئی۔ اس میں سے پولیس کا ایک آدمی نکلا۔ وہ تیزی سے ہمارے پاس آیا اور انگلش لہجہ میں کہا: براہ کرم معاف کیجئے، اسکول کے لوگوں نے یہ شکایت کی ہے کہ دو داڑھی والے آدمی یہاں روزانہ آتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ میرے ساتھی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کو ٹہلنے کی عادت ہے۔ چنانچہ ہم لوگ یہاں ٹہلنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی ایریا کے مکان نمبر ۴ ۵۹ میں۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

Oh, it is alright. I am sorry.

ہم سے بات کرنے کے بعد وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ وہاں اسکول کے ذمہ داروں سے بات کی۔ چند منٹ کے بعد وہ باہر نکلا اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس جانے لگا تو اتفاق سے اس کی کار ہمارے پاس سے گزری۔ شیشہ کے اندر سے اس نے ہماری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر دوبارہ اپنے اطمینان اور معذرت کا اظہار کیا۔

اس قسم کی ہزاروں مختلف باتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہاں کی حکومت عدل اور انسانیت کی حکومت ہے۔ مگر شاید ہی کوئی مسلمان اس کا اعتراف کرتا ہوا ملے گا۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ برطانیہ رشدی کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ وہ بوسنیا کے معاملہ میں مداخلت کیوں نہیں کرتا۔ وغیرہ۔ بعض ذاتی شکایت کی بنا پر وہ نظام کی خوبیوں کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ ابولولو فیروز کی سنت ہے نہ کہ صحابہ کی سنت۔ صحابہ جب ہجرت کرکے حبش گئے تو انھوں نے وہاں کے مسیحی بادشاہ کے عدل کا اعتراف کیا اور اس کے لئے دعائیں کیں۔ جب کہ ابولولو مجوسی کا یہ حال ہوا کہ وہ عمر فاروق کے بے مثال عادلانہ نظام کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو گیا۔ اس کو صرف اپنی ذاتی شکایت نظر آئی، اور وہ بھی اتنی مبالغہ آمیز انداز میں کہ اس نے عمر فاروق جیسے عادل حکمراں کو قتل کر دیا۔

ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ جون ۱۹۹۲ میں وہ مانچسٹر میں تھے۔ اس وقت مانچسٹر کی جامع مسجد میں نومسلم انگریز یوسف اسلام کی تقریر ہوئی۔ وہ بوسنیا کا دورہ کرکے ابھی واپس آئے تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ عرب نوجوان کے الفاظ میں یہ تھا:

إنّ الشئ الذی جعل المسلمین مستضعفین هو ذهاب الخلافة۔ فان کانت الخلافة قائمة لما استطاع احد ان یفعل بهم هٰذا۔ لان الخلافة الاسلامیة ستکون لها ایدٍ تمتد لتحمی المسلمین فی کل مکان۔ فلابد من اقامة الخلافة فهی الحل لکل ما حل بالمسلمین من ضعف وهوان۔ والا ستکون النتیجة هی الیوم بوزنیا وغداً بریطانیا

میں نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ ذہاب خلافت نہیں بلکہ ذہاب عصر ہے۔ ترکوں نے خلافت کو "تلوار" کے زور پر قائم کیا تھا۔ جب تک تلوار کا دور رہا، خلافت بھی باقی رہی۔ جب تلوار کا دور ختم ہو گیا تو ترکوں کی خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اب علم کی طاقت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے زور ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وقت کا زور (علم) موجود نہیں۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ علم کی طاقت حاصل کرنے کا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر مفروضہ دشمنوں کے خلاف ایسی جنگ چھیڑنے کا جس کا نتیجہ خود اپنی مزید بربادی کے سوا کسی اور شکل میں نکلنے والا نہیں۔

یوسف اسلام نے جو بات کہی وہ ان کی اپنی بات نہیں۔ یہ در اصل ان مسلمانوں کی بات ہے

جن کے درمیان وہ قبول اسلام کے بعد اپنے کو پا رہے ہیں۔ ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد
عبدالعزیز حدو (۲۴ سال) المغرب (الدار البیضاء) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ۱۲ ستمبر کو ایک انگریز نومسلم کو لے کر میری رہائش گاہ پر آئے۔ اس سفید فام انگریز نوجوان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ انھوں نے جولائی ۱۹۹۲ میں اسلام قبول کیا ہے۔ ان کا اسلامی نام عبدالکریم ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Christian James Stone
27 Horsford Rd Brixton SW2 5BW, London.

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کیوں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام اس لئے قبول کیا کیوں کہ اسلام معیاری اور عقلی فہم عطا کرتا ہے۔ بچپن میں اور بڑا ہونے کے بعد میں اکثر تنہا سوچتا رہتا تھا۔ جب مجھے اسلام کا علم ہوا تو اس نے میری سوچ کی تکمیل کر دی:

I embraced Islam because Islam makes perfect, rational sense. As a child and adolescent I spent much time alone, just thinking. When Islam was explained to me, it complemented to what I thought.

میں نے کہا کہ مسیحیت کا عقیدہ (مثلث ٹرینیٹی) عقلی طور پر ناقابل فہم ہے۔ وہ اس بدیہی حقیقت کے خلاف ہے کہ جو چیز تین ہو وہ ایک نہیں ہو سکتی، جو چیز ایک ہو وہ تین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسیحی حضرات میں جو لوگ زیادہ سنجیدہ ہوں وہ سخت ذہنی تضاد میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ عقل کو لیں تو مذہب چھوٹتا ہے، اور اگر مذہب کو لیں تو عقل ساتھ نہیں دیتی۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں مسیحی باقی رہتا تو میرا خیال ہے کہ میں یا تو پاگل ہو جاتا یا منافق بن جاتا تاکہ مسیحی معاشرہ میں رہ سکوں:

If I was Christian I imagine that I must either be mad or hypocrite to exist in society.

ان سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک روز وہ اپنے والد کے یہاں گئے۔ کھانے پر گوشت تھا۔ انھوں نے گوشت نہیں لیا۔ والد نے اصرار کیا تو اپنے اسلام کو چھپانے کے لئے کہہ دیا کہ میں ویجیٹرین ہوں۔ مگر والد گوشت کے لئے اصرار کرتے رہے تو انھوں نے

بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر والد نے کہا کہ میں جانتا تھا کہ تم ضرور ایسا کروگے:

I knew you would do.

میں نے اس واقعہ کو سنا تو میں نے کہا کہ بیٹے کے حق میں انگریز باپ کا یہ جملہ علامتی طور پر پوری انسانیت کے حق میں ایک پیشگی بیان ہے۔ گویا کہ مغرب کی پچھلی نسل اپنی اگلی نسل سے کہہ رہی ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک روز آئے گا جب کہ تم لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو اگر اس کے واقعی تقاضوں کے ساتھ انجام دیا جائے تو تمام باپوں کو اپنے بیٹوں سے وہی کہنا پڑے گا جو مذکورہ برطانی باپ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

لندن میں راجر ڈیوڈ اسٹون (Roger David Stone) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا موضوع فلسفہ ہے۔ وہ کالج میں استاد تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مذاہب کے مطالعہ سے دلچسپی ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے بعض صوفیاء سے ملاقات کی۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ اللہ ازلی ہے، محمد ازلی ہے، قرآن ازلی ہے۔ اس کے بعد میرا خیال یہ ہو گیا کہ اسلام بھی ایک قسم کی تثلیث (Trinity) ہے، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

مسلمانوں میں مجھے کسی ایسے سلسلۂ صوفیاء کا علم نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ عیسائیوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اسلام کو ایک قسم کے تثلیثی مذہب کے روپ میں پیش کرنے لگے۔ مسٹر راجر ڈیوڈ اسٹون مذکورہ صوفیاء کا پتہ نہ بتا سکے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ میں ان سے ربط قائم کر سکوں۔

ایک مسلمان سے میں نے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ مسیحیوں کی سازش ہے۔ وہ اسلام اور مسیحیت کو ایک ثابت کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ خواہ وہ سازش ہو یا غیر شعوری طور پر ہو، دونوں حالتوں میں اس کا حل یہ ہے کہ اسلام پر صحیح لٹریچر زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اسلام کو اتنا زیادہ معروف بنا دیا جائے کہ کوئی اس کی تصویر بگاڑنا چاہے تب بھی وہ اس کی تصویر بگاڑنے پر قادر نہ ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جس طرح ہندستان میں صوفیاء کا طبقہ ویدانت سے متاثر ہو کر وحدت الوجود کا قائل ہو گیا۔ اسی طرح مسیحی دنیا میں کچھ لوگ مسیحی تثلیث سے متاثر ہو کر مذکورہ قسم کی باتیں

کرنے لگے ہیں۔ اس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ میرے نزدیک مضاہاۃ کا اس سے بھی زیادہ بڑا واقعہ وہ ہے جو سیاسی مضاہاۃ کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی فلسفوں کا غلبہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کر ڈالی۔ چوں کہ یہ زمانہ کے مزاج کے مطابق تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد لوگوں میں پھیل گئی۔ اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مضاہاۃ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ نقصان دہ یہی سیاسی مضاہاۃ ہے۔

ایک عرب نوجوان نے اپنے کچھ قصے بتاتے ہوئے کہا کہ ایک بار میں اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ انگور خریدنے کے لئے دکان پر گئے۔ میں نے بھائی کی مخالفت کے باوجود سستا انگور خریدا۔ گھر پہنچ کر جب اس کو کھول کر کھانے کی میز پر رکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت سے انگور خراب ہیں جو کھانے کے لائق نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک حصہ کھایا اور دوسرا حصہ پھینک دیا۔ بھائی نے کہا کہ یہی مطلب ہے اس عربی مثل کا کہ الذی یعجبك رُخصه ستر می نصفه (جس چیز کا سستا ہونا تم کو پسند آتا ہے اس کا نصف حصہ تم کو پھینکنا پڑے گا)

ایک اخوانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کو معلوم تھا کہ میں مسلم حکومت کے خلاف خروج کو صحیح نہیں سمجھتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کیسے ایسا کہتے ہیں جب کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے وقت کی حکومت سے ٹکراؤ کیا۔ ہم لوگ امام احمد کے اسی مسلک پر ہیں۔

میں نے کہا کہ انھوں نے ٹکراؤ نہیں کیا بلکہ ایک غیر سیاسی معاملہ میں ٹکراؤ پیش آیا۔ پھر میں نے فقہ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ علماء اصول کا اتفاق ہے کہ جب ایک صورت حال کو دوسری صورت حال پر منطبق کیا جائے تو دونوں کے درمیان علۃ مشترکۃ کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس فقہی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آپ کے اور امام احمد کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ آپ موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے ان کے خلاف مہم چلا رہے ہیں۔ جب کہ امام احمد نے نہ تو ایسا کیا اور نہ ہی ایسا کہا۔ انھوں نے کسی بھی سیاسی ٹکراؤ کے بغیر ایک غیر سیاسی مسئلہ (خلق قرآن) کے بارہ میں اپنی رائے دی تھی اور حکومت غلط فہمی کی بنا پر ان کو سزا دینے پر تل گئی۔ اس لئے آپ کے عمل اور امام احمد کے عمل کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ اور جب علت مشترک موجود نہیں تو ان کا عمل آپ کے لئے دلیل بھی نہیں بن سکتا۔

اس معاملہ میں امام احمد کا مسلک حقیقۃً وہ ہے جو ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب جامع العلوم والحکم (صفحہ ۲۸۲) میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلطان کا سامنا مت کرو، کیوں کہ اس کی تلوار کھینچی ہوئی ہے (لا یتعرض الی السلطان فان سیفہ مسلول) یہی امام احمد کا اصل مسلک ہے اور یہی تمام دوسرے محدثین کا مسلک بھی۔

وگن کے زمانہ قیام میں کچھ لوگ ایک انگریز نومسلم کو میرے پاس لے آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ اس کو میں نے دیکھا تو وہ مجھے مجذوبانہ انداز میں دکھائی دیا۔ میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ وہ معتدل (sound mind) آدمی نہیں ہے۔ مگر بات کی تو وہ نہایت ذہین معلوم ہوا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لندن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ لندن کے مسلمانوں سے قریب ہوا تو وہ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جس مسجد میں جاتا ہر مسجد والے کہتے کہ تمہاری نماز غلط ہے۔ تم اس طرح نہیں اُس طرح نماز پڑھو کوئی کہتا کہ کوٹ پتلون اتار کر تم کو اسلامی لباس پہننا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تم کو اپنی ظالم قوم سے متنفر ہو جانا چاہئے تھا اور تم اب تک اپنے دل میں انگریز قوم کی محبت لئے ہوئے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ نظری اسلام سے وہ متاثر ہوا تھا مگر "عملی اسلام" کے بارہ میں وہ سخت توحش میں پڑ گیا۔ چوں کہ وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس تجربہ نے اس کو نیم پاگل بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے بہت سے نومسلم ہیں۔ حتی کہ یہ یہاں کا ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے۔

وگن میں ۲۲ ستمبر کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ ٹہلنے کے لئے نکلا۔ ہم لوگ ایک مقام پر پہنچے وہاں سڑک کے دوسری طرف ایک اسکول تھا۔ سفید فام بچے اسکول کے سامنے کھلے میدان میں جمع تھے۔ میں وہاں میدان کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ بچوں نے مجھ کو دیکھا تو ہاتھ ہلا ہلا کر بائی بائی کرنے لگے۔ پھر وہ دوڑ کر میرے قریب آئے۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر میں اچھی طرح ان کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ البتہ ایک بچہ جو مجھ سے کافی قریب آگیا تھا، اس نے بلند آواز میں کہا (Are you Father Chrismas) میرے ساتھی نے مزید سوال کیا تو اس نے کہا (He looks like Father Chrismas) اس اثنا میں ایک اور بچہ قریب آگیا۔ اس نے کہا:

Father Chrismas, get me a computer.

غالب گمان یہی ہے کہ بچوں نے یہ بات تفریح کے طور پر کہی۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی بچوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔ میرا حلیہ انھیں عجیب نظر آیا۔ اس لئے انھوں نے مجھ کو فادر کرسمس سے تشبیہہ دی۔

ایک عرب نوجوان سے محمد قطب کی کتاب رؤیۃ اسلامیۃ لاحوال العالم المعاصر کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل عالم عربی میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہیں جو تفکیر کو بگاڑنے والی ہیں۔ انھیں میں سے یہ کتاب بھی ہے۔ ان کو میرے اس بیان پر تعجب ہوا۔ میں نے مذکورہ کتاب (دار الوطن للنشر، الریاض) کا صفحہ ۱۸۶ دکھایا جس کا عنوان ہے: ماذا اخسر العالم بانحطاط المسلمین

میں نے کہا کہ پہلی بات یہ کہ یہ عنوان ہی صحیح نہیں۔ صحیح عنوان یہ ہونا چاہئے کہ ماذا خسر المسلمون بانحطاطہم۔ بوقت انحطاط آدمی کی توجہ اپنے خسران کی طرف ہونی چاہئے تاکہ احتساب خویش کی نفسیات پیدا ہو نہ کہ دوسروں کے خسران پر جو بے بنیاد طور پر فخر کی نفسیات پیدا کرنے والا ہے۔

میں نے کہا کہ مصنف لکھتے ہیں کہ ان اللہ جعل مقادیر البشریہ کلہا مرتبطۃ باحوال ھذہ الامۃ، ان خیر أفخیر وان شر أفشر (صفحہ ۱۸۶) میں نے کہا کہ قرآن و حدیث میں یہ بات کہاں ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم (محمد ۳۸) قرآن میں واضح طور پر یستبدل قوما غیرکم موجود ہے۔ مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ نستبدل قرآناً غیر ھٰذا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اور امت میں فرق ہے۔ جو چیز مستمر ہے وہ قرآن ہے نہ کہ امت۔ قرآن کی آیت فخلف من بعدھم خلف (مریم ۵۹) کے مطابق، ہم اخلاف الامہ ہیں نہ کہ الامہ۔

میں نے کہا کہ مقادیر بشریہ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے مرتبط کیا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔ یہ عین وہی غلطی ہے جس میں یہود مبتلا ہوئے اور بالآخر انھوں نے خدائی دین کو نسلی دین بنا دیا۔ اب مختلف الفاظ میں یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔

عرب نوجوانوں میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی ہے جو الرسالہ مشن سے پوری طرح واقف ہے اور اس سے مکمل اتفاق رکھتی ہے۔ اس سفر میں اس قسم کے کئی تجربے پیش آئے۔

اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے۔ سفر کے دوران میری ملاقات ایک عرب نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل تھا:

قال لی بعض الشباب یوما ۔ انظر الی الذی یُفعل بالمسلمین فی انحاء العالم من بوزنیا الی کشمیر، الی کل مکان۔ فھولاء یریدون أن یقضوا علی الاسلام فلا بد ان نقف لمواجھۃ الخطر بکل قوۃ (اراد القتال العسکری) فقلت لہ ان الامر الذی یُحیّرنی ولم اجد لہ تفسیر، ھو لماذا اصبح مسلموا لعصر الحدیث یعرفون کل شئ ما عدا الصبر۔ فلا یوجد شخص واحد فی العالم الاسلامی ینادی بالصبر رغم ان الصبر مذکور فی القرآن آکثر من القتال۔ فقال ھٰذا یعتمد علی الذی تقصدہ بالصبر۔ فقلت الصبر لا یعنی اللاعمل بل العمل مع التخطیط۔ فسکت۔

یہ ایک نئی سوچ ہے جو عالم اسلامی میں الرسالہ مشن کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی عرب نوجوانوں نے اپنی پوری زندگی اس مشن کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات بیان کرنے کی گنجائش سفرنامہ میں نہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں انھوں نے انگریز نومسلم یوسف اسلام کی تقریر سنی۔ وہ پوری کی پوری احتجاجی انداز کی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری تقریر میں اعداء اسلام کی سازشوں اور مظالم کا ذکر کیا۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ کیوں کہ یوسف اسلام نے جب اسلام قبول کیا تو ابتدائی زمانہ میں ان کا یہ انداز نہ تھا۔ ان کی ابتدائی زمانہ کی ایک تقریر الرسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں واضح طور پر انھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ اسلام کے روحانی پہلو نے ان کو متاثر کیا اور اس طرح وہ اسلام میں داخل ہوئے۔

اس معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی صحبت کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ تبدیلی آئی ہے۔ مغربی دنیا میں کثیر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں کوئی دعوتی کام وہ نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ خود اپنی فطرت کے زور پر یا ذاتی مطالعہ سے مغرب میں اکثر لوگ اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ یہ نومسلم جب اپنی سابقہ سوسائٹی سے کٹتے ہیں تو وہ اپنے لئے نئی سوسائٹی چاہتے ہیں۔ اس کمی کی تلافی کے لئے قدرتی طور پر وہ مغرب میں مقیم مسلمانوں سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ مسلمان زیادہ تر

احتجاجی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان نومسلموں کا مزاج بھی احتجاجی مزاج بن جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا تجربہ ہو رہا ہے وہ دراصل خدا کی تنبیہات ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان زیادتیوں کو خود ان قوموں کی سازش اور ان کے ظلم کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی مزاجی خرابی واقع ہو گئی۔ مسلمان اگر ان زیادتیوں کو تنبیہات الٰہی سمجھتے تو ان کے اندر اصلاح خویش کا جذبہ ابھرتا۔ مگر جب انھوں نے ان زیادتیوں کو اقوام غیر کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیا تو ان کے اندر برعکس طور پر احتجاج غیر کے جذبات ابھر آئے۔ اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔

وگن کے زمانہ قیام میں میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے سامنے سڑک کے کنارے زیر زمین پانی کی پائپ میں کچھ خرابی آ گئی۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی بند گاڑی وہاں آ کر کھڑی ہوئی۔ اس میں ہر قسم کا ضروری سامان موجود تھا۔ گاڑی میں سے ایک سفید فام تندرست آدمی نکلا۔ اس کے ہاتھ میں مخصوص قسم کا پھاوڑا تھا۔ وہ فوراً اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ مسلسل کام کر کے اس نے زمین کھودی۔ پائپ کو درست کیا۔ اس کے بعد پتھر کے ٹکڑوں اور تارکول سے خالی جگہ کو بھر کر پھر اس کو پختہ کیا اور چلا گیا۔

دہلی میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ اس طرح کے ایک کام کے لئے بیک وقت کئی آدمی آئیں گے۔ وہ گھنٹوں وہاں ٹھہرنے کے بعد کام کو ادھورا چھوڑ دیں گے۔ اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی کہ دوبارہ وہ کب آئیں گے اور کب اپنے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کریں گے۔

برطانیہ کے زمانہ قیام میں کبھی مکھی، مچھر وغیرہ دکھائی نہیں دیا۔ نہ حالت سفر میں اور نہ حالت قیام میں۔ میں اس کے بارہ میں کسی سے پوچھ نہ سکا۔ تاہم عملی تجربہ کے مطابق، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ مہم کے تحت اس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ مسلسل نگرانی کے بغیر خاتمہ کی صورت حال کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے جو انگریز قوم کے مزاج کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، سست عمل مگر تیقن کے ساتھ (slow but sure) محمد قطب نے اپنی کتاب رؤیة اسلامیة

حوال العالم المعاصر میں اس کو مغرب کی شیطانی سیاست کے ایک اصول کے طور پر ذکر کیا ہے۔
ر اس کا ترجمہ التدرج البطئ الاکید المفعول (صفحہ ۹۴) کیا ہے۔ مگر میرے خیال سے اس کا
ں کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوتا ہے: بطئ وانما مؤکد یا بطئ ولکن مؤکد۔

انگریز صدیوں سے اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اور ان کی کامیابی کا کم از کم ایک راز یہ بھی ہے
ں مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی تم کوئی اقدام کرو تو خواہ تمہارے سفر کی رفتار کتنا ہی
ست ہو، مگر اس بات کا پورا اہتمام کرو کہ ہر قدم یقینی طور پر نتیجہ خیز ہو۔ غور کیجئے تو موجودہ
لمانوں کا ذہن اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا اصول برعکس طور پر یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ
ے بڑے اقدام کرو، خواہ عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

مذکورہ مثل کوئی غیر اسلامی مثل نہیں۔ یہ فطرت کی زبان میں عین وہی بات ہے جو قرآن
ں ان الفاظ میں آئی ہے: فاصبر ... ولا تستعجل لهم (الاحقاف ۳۵) عجلت سے
ۃ ہوئے صابرانہ عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جذباتی انداز میں دوڑ پڑنے کے بجائے سوچ سمجھ کر عمل
ے۔ اور ایک ایک قدم پختہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر قسم
ں سرگرمیاں ہیں مگر ان کے یہاں صبر اور عدم استعجال موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر اقدام
پڑتا ہے۔ قربانیوں کے پہاڑ کھڑے کرنے کے باوجود موجودہ زمانہ میں وہ کوئی حقیقی کامیابی
مل نہ کر سکے۔

۲۴ ستمبر کو وگن میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک نومسلم انگریز سے ہوئی۔ اس
ت ان کے پاس اسلام ایز اٹ از (Islam as it is) کا ایک نسخہ موجود تھا۔ انھوں
ے اس کتاب سے آخرت کا باب نومسلم انگریز کو پڑھایا۔ پڑھنے کے بعد اس نے اپنا تاثر
ک کاغذ پر لکھ دیا۔ یہ تاثر اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

> This is very good. This is based on reason. I haven't read any other book free of any sentimental emotional plea to belief in the hereafter.

ایک مغربی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گاڈ ارائزز (God Arises) کا مطالعہ
ا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ وہی کتاب

احتجاجی نفسیات میں جی رہے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان نومسلموں کا مزاج بھی احتجاجی مزاج بن جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا تجربہ ہو رہا ہے وہ دراصل خدا کی تنبیہات ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان زیادتیوں کو خود ان قوموں کا سازش اور ان کے ظلم کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی مزاجی خرابی واقع ہو گئی مسلمان اگر ان زیادتیوں کو تنبیہات الٰہی سمجھتے تو ان کے اندر اصلاح خویش کا جذبہ ابھرتا۔ مگر جب انھوں نے ان زیادتیوں کو اقوام غیر کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیا تو ان کے اندر برعکس طور پر احتجاج غیر کے جذبات ابھر آئے۔ اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔

ڈگن کے زمانہ قیام میں میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے سامنے سڑک کے کنارے زیر زمین پانی کی پائپ میں کچھ خرابی آگئی۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی بند گاڑی وہاں آکر کھڑی ہوئی۔ اس میں ہر قسم کا ضروری سامان موجود تھا۔ گاڑی میں سے ایک سفید فام تندرست آدمی نکلا۔ اس کے ہاتھ میں مخصوص قسم کا پھاوڑا تھا۔ وہ فوراً اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ مسلسل کام کرکے اس نے زمین کھودی۔ پائپ کو درست کیا۔ اس کے بعد پتھر کے ٹکڑوں اور تارکول سے خالی جگہ کو بھر کر پھر اس کو پختہ کیا اور چلا گیا۔

دہلی میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ اس طرح کے ایک کام کے لئے بیک وقت کئی آدمی آئیں گے۔ وہ گھنٹوں وہاں ٹھہرنے کے بعد کام کو ادھورا چھوڑ دیں گے۔ اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی کہ دوبارہ وہ کب آئیں گے اور کب اپنے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کریں گے۔

برطانیہ کے زمانہ قیام میں کبھی مکھی، مچھر وغیرہ دکھائی نہیں دیا۔ نہ حالت سفر میں اور نہ حالت قیام میں۔ میں اس کے بارہ میں کسی سے پوچھ نہ سکا۔ تاہم عملی تجربہ کے مطابق، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ مہم کے تحت اس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ مسلسل نگرانی کے بغیر خاتمہ کی صورت حال کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے جو انگریز قوم کے مزاج کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، سست عمل مگر تیقن کے ساتھ (slow but sure) محمد قطب نے اپنی کتاب روية اسلامية

حوال العالم المعاصر میں اس کو مغرب کی شیطانی سیاست کے ایک اصول کے طور پر ذکر کیا ہے۔
راس کا ترجمہ التدرج البطئ الاکید المفعول (صفحہ ۹۴) کیا ہے۔ مگر میرے خیال سے اس کا
ں کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوتا ہے : بطئ وانما مؤکد یا بطئ ولکن مؤکد۔

انگریز صدیوں سے اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اور ان کی کامیابی کا کم از کم ایک راز یہ بھی ہے
ں مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی تم کوئی اقدام کرو تو خواہ تمہارے سفر کی رفتار کتنا ہی
ست ہو، مگر اس بات کا پورا اہتمام کرو کہ ہر قدم یقینی طور پر نتیجہ خیز ہو۔ غور کیجئے تو موجودہ
لمانوں کا ذہن اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا اصول برعکس طور پر یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ
ے بڑے اقدام کرو، خواہ عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

مذکورہ مثل کوئی غیر اسلامی مثل نہیں۔ یہ فطرت کی زبان میں عین وہی بات ہے جو قرآن
ں ان الفاظ میں آئی ہے : فاصبر ... ولا تستعجل لھم (الاحقاف ۳۵) عجلت سے
تے ہوئے صابرانہ عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جذباتی انداز میں دوڑ پڑنے کے بجائے سوچ سمجھ کر عمل
ے۔ اور ایک ایک قدم پختہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر قسم
ں سرگرمیاں ہیں مگر ان کے یہاں صبر اور عدم استعجال موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر اقدام
ا پڑتا ہے۔ قربانیوں کے پہاڑ کھڑے کرنے کے باوجود موجودہ زمانہ میں وہ کوئی حقیقی کامیابی
مل نہ کر سکے۔

۲۴ ستمبر کو وگن میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک نومسلم انگریز سے ہوئی۔ اس
ت ان کے پاس اسلام ایز اٹ از (Islam as it is) کا ایک نسخہ موجود تھا۔ انھوں
ے اس کتاب سے آخرت کا باب نومسلم انگریز کو پڑھایا۔ پڑھنے کے بعد اس نے اپنا تاثر
ک کاغذ پر لکھ دیا۔ یہ تاثر اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

> This is very good. This is based on reason. I haven't read any other book free of any sentimental emotional plea to belief in the hereafter.

ایک مغربی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گاڈ ارائزز (God Arises) کا مطالعہ
ا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ وہی کتاب

ہے جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کئی تعلیم یافتہ مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اسلامی لٹریچر کے ذخیرہ میں گاڈ ارائزز جیسی اور کتابیں پائی جاتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات کو علمی اور عقلی دلیل کے ساتھ بیان کرتی ہوں۔ مگر کوئی شخص مجھے اس قسم کی کسی اور کتاب کا سراغ نہ دے سکا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ قرآن تو سراپا عقلی کتاب ہے۔ وہ عقل کو مخاطب کرکے اپنا پیغام دیتا ہے۔ مگر آجکل کے مسلمانوں کے ذہن سے یہ پہلو مخفی ہوگیا۔ وہ عقلی دلیل اور عقل کو مطمئن کرنے والے اسلوب میں دین کے داعی نہ بن سکے۔ ورنہ ایسی بہت سی کتابیں اسلامی کتب خانہ میں موجود ہوتیں۔ آج کا انسان عقلی اطمینان کے بعد کسی عقیدہ کو اختیار کرتا ہے اور ہمارے پاس عقل کو مطمئن کرنے والی کتابیں نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے عجیب انداز میں کہا کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو اکثر میری زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں :

Oh, Allah, help us to do intellectual jihad. And bring the rational unbelievers to the fold of Islam.

۲۴ ستمبر کی شام کو وگن سے واپسی ہوئی۔ یہاں سے بذریعہ ٹرین مجھے برمنگھم پہنچنا تھا۔ دو عرب نوجوان جو ریلوے اسٹیشن تک مجھے پہنچانے آئے تھے۔ وہ میرے ساتھ ڈبہ میں داخل ہوگئے۔ وہ اتر نا چاہتے تھے کہ ڈبہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ یہاں ٹرین کے دروازہ کو ڈرائیور کھولتا ہے اور وہی بند کرتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ ہندستانی تجربہ کے تحت مجھے تشویش ہوئی۔ مگر ٹکٹ چیکر آیا تو اس نے پوچھ گچھ کی نہ جرمانہ لگایا۔ سادہ طور پر اس نے کرایہ لے کر وہی ٹکٹ دے دیا جو اسٹیشن پر انھیں ملتا۔ اور پھر تھینک یو کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ٹرین نہایت صاف ستھری تھی۔ سیٹ سے لے کر ٹائیلٹ تک ہر چیز بالکل ہوائی جہاز کے اندا کی نظر آئی۔ میں نے کہا کہ یہ ٹرین تو گویا زمین پر دوڑتا ہوا ہوائی جہاز ہے۔ ڈبہ میں جگہ جگہ نو اسموکنگ کا اعلان لگا ہوا تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ اس کی خلاف ورزی پر پچاس پونڈ جرمانہ ہے۔ یعنی ہندستانی روپیہ میں تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ۔ ایک طرف ایک خوبصورت کیس میں ایک خوبصورت ہتھوڑا رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ ایمرجنسی کی حالت میں کھڑکی کے شیشہ کو توڑنے کے لئے اس ہتھوڑے کو استعمال کیجئے :

دہلی کے انگریزی اخبار اکونومک ٹائمس کے نمائندہ مسٹر کامل ظہیر نے ۲ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو کا تعلق شرعی قوانین سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں سزا کا حق صرف باقاعدہ عدالت کو ہے۔ عدالتی ادارہ کے علاوہ کوئی شخص اگر کسی کو مجرم بتا کر اسے سزا دے تو یہ سراسر حرام ہوگا۔ اور اس طرح کسی کو سزا دینے والا خود سب سے بڑا مجرم قرار پائے گا۔

فرنچ نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۷ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ بابری مسجد اور رام مندر کے نام پر دونوں فرقوں میں جو جذباتی اُبال آیا تھا، ایسا بار بار نہیں ہوتا۔ یہ جذباتی ابال ایک بار آکر اب ہمیشہ کے لئے اس امکان کو ختم کر چکا ہے کہ مسجد مندر کے نام پر دوبارہ ایسا ابال ملک میں آئے۔

ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر جوہر عبد اللہ نے ۱۱ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے مسلم ہریجن اتحاد کے بارہ میں تھا۔ بتایا گیا کہ اس قسم کا اتحاد وقتی طور پر کچھ لیڈروں کو سیاسی فائدہ دے سکتا ہے مگر اس سے نہ مسلمانوں کا کوئی حقیقی فائدہ ہونے والا ہے اور نہ ہریجنوں کا۔ ضرورت ہے کہ دونوں کے اندر قومی سوچ پیدا کی جائے نہ کہ گروہی بنیاد پر محاذ آرائی کی سوچ۔

راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ۱۱ اپریل ۱۹۹۴ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: India-Pakistan Relation اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ سیمنار جواہر بھون (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔

بھارتیہ مزدور سنگھ کی طرف سے ایک آل انڈیا کانفرنس ناگپور (ریشم باغ) میں ۱۶ - ۱۷ اپریل ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں افتتاحی خطاب کے طور پر ایک تقریر کی اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں

سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۶ پانچ جنیہ (ہندی ہفت روزہ) کے اڈیٹر مسٹر ترن وجے نے ۲۰ اپریل ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلیفون پر ریکارڈ کیا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان مرد اگر انصاف لینے کے لئے ملکی عدالتوں میں جاتا ہے تو مسلمان عورت بھی انصاف لینے کے لئے ملکی عدالت میں جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کے خلاف نہیں۔

۷ نئی دہلی کی تنظیم (Movement for National Resurgence) کے تحت ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع بحث یہ تھا ــــــ (are the police above the law) اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور "کیا پولیس قانون سے بالا ہے" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۸ یو این آئی کی نمائندہ مسز نصرت نے ۲۴ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر جسٹس تلہری کے تازہ فیصلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مذہبی قانون کی تعبیر کا حق ہمیشہ مذہبی علما کو ہوتا ہے کسی عدالت کو اس کا حق حاصل نہیں۔

۹ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر پرمود نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یونیفارم سول کوڈ موجودہ حالت میں چلنے والا نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندستانی سماج عام طور پر اتنا زیادہ روایت پرست ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی بھی خارجی قانون کو قبول نہیں کرے گا۔

۱۰ دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر ارن کمار پانڈے نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق قرآن کی ان آیتوں سے تھا جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں غلمان ہوں گے۔ اس کا انھوں نے نہایت غلط مطلب لے رکھا تھا۔ انھیں اس آیت کی صحیح تشریح بتائی گئی اور ان کی غلط فہمی دور کی گئی۔

۱۱ یوپی بھون (نئی دہلی) میں ۲۸ اپریل ۱۹۹۴ کو امرت کلش کے سپادک منڈل کی میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کے ڈسکشن میں شریک ہوئے

طے ہوا کہ مختلف مذاہب پر تعارفی مقالات تیار کرکے ان کو ایک جلد میں شائع کیا جائے۔ "اسلام اور انسانیت" کے موضوع پر مقالہ لکھنے کا کام صدر اسلامی مرکز کے سپرد کیا گیا۔ یہ مجموعہ ہندی اور اردو میں شائع کیا جائے گا۔

۱۲ ہفت روزہ نئی دنیا کے نمائندہ نے ۲ اپریل ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوال وجواب کا تعلق زیادہ تر جسٹس تلہری کے فیصلہ کی روشنی میں طلاق کے شرعی قانون سے تھا۔

۱۳ الکٹرانکس نکیتن کے کانفرنس ہال (نئی دہلی) میں ۲۹ اپریل ۱۹۹۴ کو آل انڈیا اسلامی تعلیمی کنونشن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ایک بات یہ کہی کہ تعلیم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ مسلم اسکول اور مسلم نصاب کے دائرہ سے باہر نکل کر ہمیں اپنی نسلوں کو تعلیم میں داخل کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں غیر ضروری حساسیت کی ضرورت نہیں۔

۱۴ چنتک منڈل کی طرف سے جواہرلال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ۲ مئی ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع ہندستانی انسائیکلو پیڈیا (Encyclopaedia Indica) کا منصوبہ طے کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں دوسری میٹنگ ۱۱ مئی کو جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں ہوئی۔

۱۵ ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اشوک ملک نے ۳ مئی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نکاح وطلاق کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یکم مئی کو مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ جسٹس تلہری کے فیصلہ پر مسلمان ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر یہ آدھی بات ہے۔ ان لوگوں کو اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہئے کہ شاہ بانو کے معاملہ میں اور بابری مسجد کے معاملہ میں ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار کرکے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مسلم عوام کے ذہن کی صفائی کے لئے غلطی کا اعتراف بھی ضروری ہے۔

۱۶ ایشین ایج (Asian Age) کی نمائندہ مسز شیلا ریڈی نے ۶ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ٹیلی فون پر لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آثار قدیمہ کی مساجد اور ان کے مسائل کے بارہ میں تھا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقـ
مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوتـ
عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھ
بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کـ
متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت۔
اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ـ
جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

12494
4.9.95

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تا پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	5 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$ 80 / £40	0 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that i in the very nature of things. But repeated emphasis on the darke side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lea only to discouragement, depression and inertia. The better way t find solutions to the problems besetting us would be to seek out an lay stress on whatever opportunities present themselves, so tha those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged t take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, o how, in entering upon the more positive avenues open to them Muslims may avail themselves of the same kind of opportunitie right here in India as they would find at any other point on th globe. For them treading this path is treading the path of wisdom

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

